اعداد و ترتیب:
محمد حارث باسم

اردو (لازمی)

اہم موضوعات

ڈگری کلاسز کے لیے

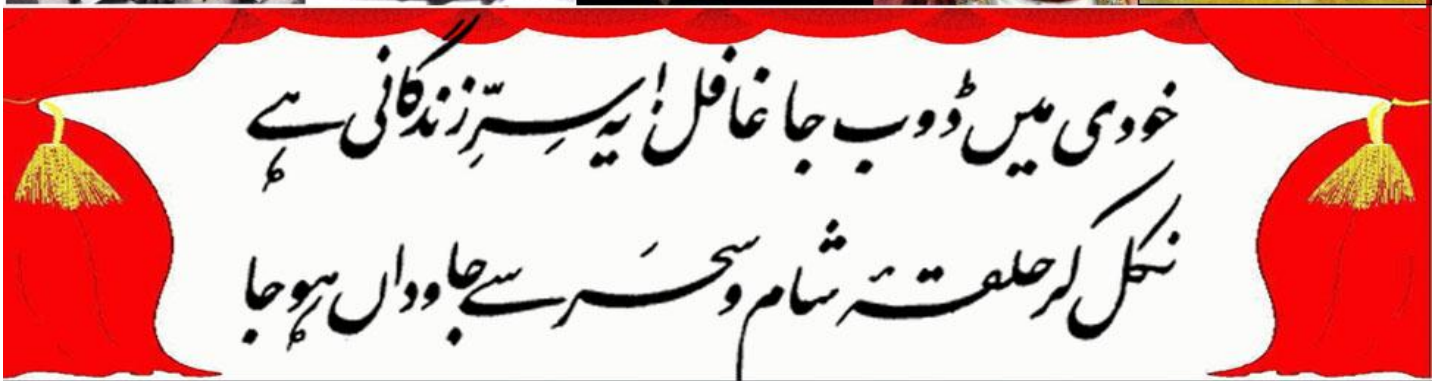

انتساب

عزیزم والدین محترمین کے نام

جنہوں نے ہر اس پل جب میں لڑکھڑایا، مجھے سہارا دیا

اور جن کے حسن تربیت اور کمال نظر نے مجھے کسی قابل کیا

... اور ...

انتہائی محترم و مؤقر

جملہ اساتذہ کرام کے نام

جن کی بے پناہ شفقت، بے بہا محنت اور جا بجا حوصلہ افزائی ہی

نے مجھ ایسے نالائق طفل مکتب کو کسی قابل بنایا

محمد حارث باسم

اسباق کے خلاصے

سیر دوسرے درویش کی

(میر امن دہلوی)

تعارف:

میر امن دہلوی کا یہ مضمون ''قصہ چہار درویش (باغ و بہار) سے ہے ایک درویش اپنا قصہ سنا چکا تو دوسرے درویش کی باری آئی اس نے اپنی باری آنے پر بیان کرتے ہوئے کہا کہ اے لوگوں میں فارس کا شہزادہ ہوں میرے والد نے میری تعلیم و تربیت میں کوئی کسر نہ چھوڑی اور میں کم عمری میں ہی تمام علوم وفنون اور سلطنت کے تمام آداب سے واقف ہو گیا۔

خلاصہ:

ایک دن ایک عقلمند مصاحب نے کہا کہ انسان کی زندگی چند روزہ ہے نہ جانے کب اس کی زندگی ختم ہو جائے بعض خصوصیات ایسی ہے جو اگر انسان میں پیدا ہو جائیں تو اس کا نام قیامت تک زندہ رہ سکتا ہے۔ میں نے اس سے تفصیل میں جانے کو کہا تو اس نے حاتم طائی کا قصہ سنایا جو سخاوت میں بہت مشہور تھا اس نے کہا کہ حاتم طائی کے زمانے میں ایک نوفل نام کا بادشاہ تھا اس نے حاتم طائی کی مقبولیت کا حال سنا تو وہ اس سے جلنے لگا اور اس کے خلاف جنگ پر آمادہ ہو گیا۔ حاتم ایک رحم دل شخص تھا اس نے یہ خیال کیا کہ اگر جنگ ہوئی تو اس میں خدا کے بہت سارے بے گناہ انسان مارے جائیں گے اور یہ چھپ کر بیٹھ گیا۔ نوفل کو جب اطلاع ملی کہ حاتم کہیں چھپ گیا ہے تو اُس نے حاتم کے گھر پر قبضہ کر لیا اور اس کا تمام مال و اسباب بھی لوٹ لیا اور اس کے ساتھ یہ اعلان بھی کروا دیا کہ جو حاتم کو پکڑ کر لائے گا اس کو ۱۵۰۰ اشرفیاں انعام کے طور پر دی جائیں گی۔

یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی ہر کوئی یہ چاہتا تھا کہ وہ حاتم کو پکڑ کر بادشاہ کے سامنے لائے اور انعام پائے ایک دن ایک بوڑھا اس کی بیوی اور بچے جنگل میں لکڑیاں کاٹ رہے تھے بڑھیا بوڑھے سے کہنے لگی کہ کاش حاتم ہمیں ہی مل جائے تا کہ بادشاہ سے ہم ۱۵۰۰ اشرفیاں حاصل کر لیں اور ساری زندگی عیش کریں بوڑھے نے بڑھیا کی بات کی سن کر کہا کہ تو یہ فضول کی بک بک نہ کر ہماری تقدیر ایسی کہاں۔۔۔ ہماری قسمت میں تو صرف لکڑیاں ہی کاٹنا لکھا ہے۔ اتفاق ہے کہ جہاں دونوں اس قسم کی گفتگو کر رہے تھے وہیں قرے میں ہی حاتم چھپا ہوا تھا اس نے دونوں کی باتیں سن لی تھیں اُسے ان کی حالت پر رحم آ گیا اور وہ غار سے نکل کر ان کے رُوبرو آ گیا اور کہنے لگا کہ حاتم میں ہوں مجھے تم بادشاہ کے پاس پکڑ کر لے جاؤ اور انعام حاصل کر لو۔

بوڑھے نے حاتم کی بات سنی تو کہا میں تجھے اپنی لالچ کی خاطر دشمن کے حوالے نہیں کروں گا۔ یہ دولت میں کب تک کھالوں گا آخر مجھے اُس دنیا میں جانا ہے خدا کو کیا منہ دکھاؤں گا۔ جب بوڑھا کسی طرح نہ مانا تو حاتم نے کہا کہ اے بوڑھے! اگر تو مجھے اس طرح لے کر نہیں چلے گا تو میں خود بادشاہ کے سامنے چلا جاؤں گا اور کہوں گا کہ تو نے ہی مجھے یہاں چھپا رکھا ہے۔ اسی بحث و تکرار میں بہت سے اور لوگ بھی جمع ہو گئے اور سب کو علم ہو گیا کہ یہی حاتم طائی ہے انہوں نے فوراً ہی اس کو پکڑ لیا اور بادشاہ کے سامنے لے آئے۔ بوڑھا بھی افسوس کرتا ہوا ان کے ساتھ چل دیا۔

حاتم کو بادشاہ کے سامنے لایا گیا ہر شخص کا دعویٰ تھا کہ حاتم کو اس نے پکڑا ہے بوڑھا سب سے پیچھے کھڑا افسوس کر رہا تھا۔ حاتم نے اس موقع پر خود بادشاہ سے کہا کہ سچ یہ ہے کہ وہ بوڑھا جو چپ چاپ کونے میں کھڑا ہے وہی مجھے پکڑ کر لایا ہے اور یہ ہی انعام کا حقدار ہے۔ بادشاہ نے بوڑھے کو بلایا اور تمام حقیقت پوچھی۔ بوڑھے نے سب کچھ سچ بیان کر دیا اور کہا کہ حاتم میری خاطر خود یہاں چلا آیا ہے۔

نوفل پر حاتم کی اس جرأت و ایثار کا حال سن کر خاصا اثر ہوا۔ اس نے فوراً حکم دیا کہ تمام چھوٹے دعویداروں کو گرفتار کر کے ان کو ۱۵۰۰ اشرفیوں کے بجائے ان کے سروں پر ۵۰۰ جوتے برسائے جائیں اور بوڑھے کو ۱۵۰۰ اشرفیاں دے کر رخصت کیا جائے اس کے بعد اس نے حاتم کا ہاتھ پوری عقیدت اور گرم جوشی کے ساتھ پکڑ لیا اور کہا تم جیسے سخی سے جو مختاجوں پر اپنی جان تک دے دے دشمنی رکھنی جوانمردی کے خلاف ہے۔ مختصر یہ کہ بادشاہ نے حاتم کی نہایت عزّت کی اور اس کے

W.HARIS BASIM

مال واسباب وملک اس کو واپس کر دیا۔

حاتم کی سخاوت کی کہانی سننے کے بعد میرے دل میں خیال آیا کہ میں ایران کا بادشاہ ہوں۔مگر سخاوت کی نعمت سے محروم ہوں اس لیے مجھے بھی کچھ ایسا ہی کام کرنا چاہئے جو سخاوت کی تعریف میں آئے یہ خیال آتے ہی میں نے ایک عالی شان عمارت بنانے کا حکم دیا جس کے ۴۰ دروازے تھے۔عمارت جلد تعمیر ہوگئی میں اس عمارت میں ہر روز فجر سے شام تک رہتا اور محتاجوں کو اشرفیاں تقسیم کرتا۔

ایک دن کا ذکر ہے کہ ایک فقیر سامنے کے دروازے سے آیا اور ایک اشرفی لے گیا اس کے بعد دوسرے دروازے سے آ کر دو اشرفیاں لے گیا اس طرح وہ ہر دروازے سے آتا اور ایک ایک اشرفی بڑھاتا جاتا میں جان بوجھ کر اس کے سوالوں کو رد نہ کرتا آخر جب وہ چالیسویں دروازے سے آیا تو اس نے چالیس اشرفیاں مانگیں میں نے اس کو وہ بھی دے دیں اتنا کچھ حاصل کرنے کے بعد وہ فقیر پھر پہلے دروازے سے داخل ہو گیا اور سوال کرنے لگا اب مجھے بُرا سا معلوم ہوا اور میں نے اس سے کہا کہ اے فقیر تو لالچی ہے تُو فقر کے معنوں سے واقف نہیں۔اس نے سوال کیا تم ہی بتاؤ۔میں نے کہا ''ف'' سے ''فاقہ''، ''ق'' سے ''قناعت'' اور ''ر'' سے ''ریاضت''، جس میں یہ باتیں نہ ہوں وہ فقیر نہیں تُو اتنا مال اکھٹا کر کے کیا کرے گا۔فقیر یہ سن کر ناراض ہوا اور اس نے سارا مال زمین پر ڈال دیا اور کہنے لگا اب سخاوت کا نام کبھی نہ لینا۔سخی ہونا بہت مشکل کام ہے۔سخی کے بھی تین حروف ہیں پہلے ان پر عمل کرو تب سخی کہلاؤ گے۔میں نے وضاحت چاہی تو اس نے کہا ''س'' سے ''سمائی''، ''خ'' سے ''خوفِ الٰہی'' اور ''ی'' سے ''یاد رکھنا اپنی پیدائش اور موت کو''۔اس نے یہ بھی کہا کہ سخی کا درجہ کہ اگر بدکار ہو تو بھی خدا کا دوست ہے۔فقیر نے مزید کہا کہ میں نے بہت سے ملکوں کی سَیر کی ہے سوائے بصرے کی شہزادی جیسا کوئی سخی نہ دیکھا۔مجھ پر اس کی باتوں کا خاصا اثر ہوا اور میں نے اس کی بڑی منّت سماجت کی کہ وہ یہ مال واپس لے لے مگر اس نے صاف انکار کر دیا اور یہ کہہ کر چل دیا کہ اب تو اگر اپنی ساری بادشاہت بھی مجھے دے دے تو میں نہ لوں اور اس پر لات ماردوں۔

اس کے جانے کے بعد میرے دل میں یہ آرزو پیدا ہوئی کہ بصرے جاؤں اور کسی طرح سے اس شہزادی سے ملاقات کروں جس کا قصہ اس فقیر نے مجھے سنایا ہے۔

M.HARIS BASIM

بندر کی تقریرِ دل خراش

(رجب علی بیگ سرور)

تعارف:

یہ کہانی فسانہ عجائب سے اخذ کی گئی ہے اس کہانی میں رجب علی بیگ نے شہزادہ جانِ عالم اور اس کے دوست وزیرزادے کا وقوعہ بیان کیا ہے۔

خلاصہ:

شہزادہ جان عالم کو اس کا وزیر جادو کے زور سے ایک بندر بنا دیتا ہے اور خود شہزادے کا روپ دھار کر حکومت پر قبضہ کر لیتا ہے بندر یعنی جان عالم ایک چڑی مار کے قبضہ میں آ جاتا ہے نقلی شہزادے کو یہ ڈر ہوتا ہے کہ اس کا یہ بھید کھل نہ جائے اس لئے وہ بندروں کو مروانا شروع کر دیتا ہے اس کا خیال تھا کہ سلطنت میں موجود جب تمام بندر ختم ہو جائیں گے تو اس طرح شہزادہ جان عالم جو بندر بنا ہوا ہے اس کا کام بھی تمام ہو جائے گا۔نقلی شہزادے کو یہ علم تھا کہ انسانوں کی طرح بولتا ہوا ایک بندر کہیں پایا جاتا ہے جب اس بولتے بندر کی تلاش کا اعلان ہوا تو چڑی مار جس کے قبضے میں بندر تھا کسی دوسرے شہر چلا گیا اس کی رہائش گاہ ایک سرائے کے قریب تھی سرائے کی مالکہ اچانک کسی کام سے اس چڑی مار کے گھر پہنچی جس کے پاس یہ بندر تھا۔مالکہ نے جب یہ بندر دیکھا تو فوراً اس کا ذکر ایک سوداگر سے کر دیا جو سرائے میں رہتا تھا سوداگر چڑی مار کے پاس پہنچا اس سے وہ بندر طلب کیا لیکن چڑی مار بندر دینے پر راضی نہ تھا لیکن بندر کے سمجھانے پر چڑی مار اس شرط پر بندر سوداگر کو دینے پر تیار ہو گیا کہ وہ اسے وزیرزادے کے سپاہیوں کے حوالے نہ کرے گا۔سوداگر نے ایسا ہی کیا اور اس بندر کا خاص خیال رکھا لیکن ایک دن کسی طرح نقلی شہزادے کو علم ہو گیا کہ سوداگر کے پاس انسانوں کی طرح بولنے والا بندر ہے اس نے فوراً ایک آدمی اس کے پاس بھیجا کہ بندر کو نقلی شہزادے کی خدمت میں پیش کرو لیکن سوداگر نہ مانا

اوراس نے انکار کر دیا پھر نقلی شہزادے نے جس ملک میں سوداگر رہتا تھا اس ملک کے شہزادے کو لکھا کہ اگر اپنی سلطنت کی خیر چاہتے ہو تو جس طرح بھی ہو بندر حاصل کر کے مجھے روانہ کرو۔ تب اس ملک کے شہزادے نے نہایت غصے میں سوداگر کو بلایا کہ اس بندر کو جلد میرے پاس لاؤ یہ دھمکی پڑھ کر سوداگر نے فیصلہ کیا کہ وہ بندر کو شہزادے کے پاس ضرور لے جائے گا اور ہر طرح اس کی جان بچائے گا۔ مختصر یہ کہ سوداگر بندر کو لے کر شہزادے کی خدمت میں حاضر ہونے کو چلا جب سوداگر اس بندر کو لے کر روانہ ہوا تو ہزاروں لوگ اس بندر کو دیکھنے کے لئے راستہ میں جمع تھے اس وقت بندر نے لوگوں کے سامنے ایک تقریر کی جس میں دنیا کی بے ثباتی اور انسانی ہستی کی ناپائیداری بیان کی۔ اس تقریر کا لوگوں کے دلوں پر اثر ہوا اور وہ لوگوں نے اس سے نصیحت بھی حاصل کی بہت سے لوگ اس تقریر کو سن کر آہ و بکا کرنے لگے وہ بندر کبھی نصیحت کرتا کبھی وحشت زدہ ہو جاتا۔ اسی حالت میں یہ لوگ ملکہ کے شہر تک پہنچے وہ ان کی آمد کی راہ تک رہی تھی۔ وہ سوداگر سے فرمانے لگی کہ رُک جا میری بھی خواہش ہے کہ میں اس بے زبان کی تقریر سنوں ملکہ نے کہا اے بے زبان مقرر تیرا وطن چھوٹا اور تیرا گھر بار کہیں کھو گیا لیکن اب ہم بھی تیری کسی مدد کے لائق نہیں رہے لیکن ہم تیری داستان سننا چاہتے ہیں جو تجھ پر گزرتی وہ سب کچھ ہمیں سنا دے بندر نے ملکہ کی آواز پہچان لی پہلے خوب رویا پھر افسوس کرتے ہوئے بولا کہ افسوس جس کو ہم نے دوست سمجھا وہ آستین کا سانپ نکلا وہ ہمیں قتل کروانا چاہتا ہے۔ حالانکہ ہمارے دوستوں نے بہت سمجھایا تھا کہ اسے ایک حد دوست مانو لیکن ہم نے پرواہ نہ کی اب ہم پچھتا رہے ہیں اس نے ہمیں اس حال کو پہنچا دیا ہے۔ اور ہر صورت میں میں ختم کرنا ہی چاہتا ہے۔ بندر یعنی جان عالم نے اپنی داستان ملکہ کو سنا تو دی لیکن یہ سوچ کر ڈر گیا کہ اگر وزیرزادے کو ہم ہو گیا تو وہ اُسے جان سے ختم کر دے گا۔ بندر نے مزید کہا کہ جو جانتا ہے وہ دیکھتا ہے اور جسے خبر ہیں اس سے کہہ دو (ملکہ سے) ہم صرف تمہارے عشق میں اس حال تک پہنچے ہیں اور اب قتل ہو رہے ہیں تم بھی چھت پر آ کر میرے مرنے کا تماشا دیکھ لو۔ ملکہ نے بندر کی بات سنی تو اس کا جو کچھ شک تھا وہ بھی ختم ہو گیا اور وہ جان گئی کہ یہ ہی جان عالم ہے جواب دیا جو جانتے تھے وہ کچھ نہ کر سکے اور جسے کچھ معلوم ہی نہیں اُسے تکلیف دینے سے کیا فائدہ۔ اس کے ساتھ ہی طوطے کی گردن مروڑ پنجرہ باہر نکلا۔ بندر کی نگاہ پنجرہ پر پڑی سمجھا ملکہ اسے پہنچان گئی یہی فرصت کا وقت ہے شور وغل تو ہوا تھا لیکن کسی نے یہ دیکھا بندر سوداگر کی گود میں لیٹ کر طوطے کے دل پر پرواز کر آیا طوطا پھڑکا۔ ملکہ خوش ہو گئی اور پنجرہ اندر کھینچ لیا۔ سوداگر نے دیکھا بندر مر گیا خواہش ہوئی کہ خود بھی مر جائے تا کہ بدنامی کا داغ مٹ جائے جو شخص اس کے قریب بیٹھا تھا اس کو سمجھانے لگا کہ جو ہوا اچھا ہوا اب صبر کر و اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

آگے چل کر مزید کہا گیا ہے کہ جب لوگوں کو اس بات کا علم ہوا کہ بندر مر گیا ہے تو انہوں نے آہ و بکا شروع کر دی۔ سب نے اس بات پر اتفاق کیا کہ بس بندر عقلمند تھا۔ وزیر اسے حاصل نہ کر سکا۔ بندر سوداگر کی گود خالی کر گیا اور مر گیا جب وزیرزادے کو بندر کے مرنے کی خبر ہوئی تو اس نے اسی پر بس نہ کیا بلکہ اس کی لاش منگوائی اسے جلایا اور اس کی خاک تک اڑا دی تب کہیں جا کر اُسے چین آیا۔ جب یہ سب کچھ ہو چکا تو ملکہ مہرنگار پنجرہ لے آئی اور لوگوں کے قریب کر دیا طوطے نہ شروع سے آخر تک تمام تفصیل لوگوں کو سنا دی۔ اسی دوران وہ وزیرزادہ آ پہنچا ملکہ باہر نکل آئی اور اس کی خاطر تواضع کرنے لگی حالانکہ اس سے قبل وہ آتا تھا تو ملکہ اس کو منہ نہ لگاتی تھی اور وہ ناراض ہو کر چلا جاتا تھا لیکن اُس دن اُس نے نئی تبدیلی دیکھی تو سمجھا کہ بندر کا مرنا ملکہ نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا ہے اس لئے اس کے رویہ میں تبدیلی آ گئی ہے اس لئے وہ نرمی کر رہی ہے اس نے سوچا خیر جلدی نہ کرو سب کچھ آہستہ آہستہ ٹھیک ہو جائے گا پس جب وہ ملکہ کے پاس سے جانے لگا تو اس نے فرمائش کی کہ ایک بکری کا بچہ بھیج دو وزیرزادے نے اس خواہش کا احترام کیا اور ایک بکری کا بچہ اُسے بھیج دیا اس کے بعد پھر وہ آیا تو ملکہ پہلے سے زیادہ اس کی جانب متوجہ تھی اس کے سامنے وہ بچہ سے کھیلنے اور خوش ہونے لگی دو تین روز تک یہی سلسلہ جاری رہا۔ لیکن ایک دن موقع پا کر بکری کے بچے کو دبا کر بے جان سا کر دیا اور ایک شخص کو دوڑایا کہ وہ وزیرزادے کو خبر کرے کہ وہ جلد آئے اگر اس نے دیر کی تو میں نہ ملوں گی یہ خبر سن کر وہ نقلی شہزادہ فوراً حاضر ہو گیا ملکہ نے پنجرہ اُس اوچ سلطنت کے پلنگ کے پاس رکھ لیا جب وہ سامنے آیا تو ملکہ نے بکری کے بچہ کو گود میں اٹھا کر اس شدت سے دبایا کہ وہ مر گیا۔ ملکہ یہ کر کے رونے لگی شہزادے نے کہا کیوں روتی ہو ملکہ نے کہا اگر میری خوشی عزیز ہے تو اُسے ابھی زندہ کرو وہ بولا مردہ کبھی جیا ہے کبھی کسی نے ایسا کیا ہے سوائے مسیح کے' ملکہ نے کہا واہ! تم نے میری مینا جو جلائی تھی جب پھڑکی تھی دل میں آیا کہ شاید یہ شہزادے کی حرکت ہو سکتی ہے۔ دنیا میں مثال ہے جیسا جو کرے گا ویسا ہی بھرے گا یعنی جو بوئے گا وہ کاٹے گا ہر فرعون کے لئے اللہ نے ایک موسیٰ پیدا کیا ہے۔

بہر حال شہزادہ ہر حال میں ملکہ کو خوش کرنا چاہتا تھا لہٰذا اُس نے ملکہ سے کہا بچہ گود میں رکھ دو ملکہ نے پھینک دیا وہ پلنگ پر لیٹا جادو سے اپنی روح بچے کے قالب میں لایا بچہ زندہ ہو گیا اور کودنے لگا۔ ملکہ خوش ہو گئی بچے کو پیار کیا۔ شہزادے نے خیال کیا کہ اُس وقت تک ملکہ بہل جائے پھر اس روح کو نکال کر اپنے قالب

میں لے جاؤں گا۔لیکن اس کو یہ خیال نہ آیا کہ اب خاصی دیر ہو چکی ہے اس کی قسمت اب کچھ اور ہی پکار رہی ہے وہ اب اُس جسم کے نزدیک نہیں جا سکتا اور روح واپس اپنے قالب میں نہیں لا سکتا۔

شہزادہ جان عالم یہ تمام ماجرا پنجرے سے دیکھ اور سن رہا تھا قالب کو خالی پایا فوراً روح اپنے جسم میں لایا۔نقلی شہزادہ جان عالم کو دیکھ کر خوفزدہ ہو گیا اور اس نے سمجھ لیا کہ اب اس کے بُرے دن آ چکے ہیں۔ساتھ ہی ملکہ نے جلدی سے دو منتر پڑھ کر اس کی طرف پھونک دیئے کہ وہ اپنے قالب میں روح لے جانا ہی بھول گیا۔اب اس وزیرزادے کو ڈر تھا کہ کسی وقت بھی اپسے ختم کیا جا سکتا ہے۔آگے چل کر بتایا گیا ہے کہ جب وزیرزادے کا معاملہ ختم ہو گیا پھر انجمن آراء کو بلا کر کہا گیا کہ مبارک ہو اللہ نے تمہاری و ہماری عزت بچالی ہے اور ہمیں ملا دیا ہے میں آپ کا شہزادہ جان عالم ہوں اور یہ بکری کا بچہ بے ایمان وزیرزادہ ہے یہ کہہ کر تینوں مل کر خوب روئے' گلے شکوے دور ہوئے مبارک سلامت کا شور ہوا۔جان عالم نے اسی وقت سوداگر کو بلایا اور اسے اپنی تمام آپ بیتی سے آگاہ کیا۔اس کے بعد خدا کا شکر ادا کیا گیا سوداگر کو بہت سا انعام دیا گیا۔ہاتھ پالکی عنایت کی اور وطن واپس آنے کا پکا وعدہ بھی لیا گیا۔پھر چڑی مار اور اس کی بیوی کو بلایا اسے بھی بہت سا انعام دیا اور ساتھ ہی اُسے مملک کے چڑی ماروں کا چوہدری بنا دیا اس کے بعد واپسی کی تیاری کی۔اس طرح تمام اپنی اپنی منزل کی جانب رواں دواں ہو گئے۔

جانی دشمن

(عصمت چغتائی)

''جانی دشمن'' یہ افسانہ عصمت چغتائی نے تحریر کیا ہے افسانہ کچھ اس طرح شروع ہوتا ہے (عالیہ اس افسانے کا ایک کردار ہے) عالیہ کو اس کی خالہ نے بلایا تھا وہ اس کی منہ بولی خالہ تھی۔عالیہ جب کالج آئی تو اس نے اپنی کلاس کے علاوہ دوسری کلاس کی لڑکیوں سے بھی اچھی دوستی قائم کر لی اور اساتذہ سے بھی میل ملاپ بڑھا لیا۔اس طرح وہ ان کی خوشیوں میں آگے آگ رہتی کوئی بھی مسئلہ ہو عالیہ پیش پیش ہوتیں۔وہ ایک سیدھی سادھی اور بے وقوف سی لڑکی تھی جس کے جی میں آتا اسے بے وقوف بنا کر اپنا اُلو سیدھا کر لیتا تو ہر معاملہ میں دوسروں کی مدد کرنے پر تیار رہتی۔ایسا نہ تھا کہ وہ کوئی امیر زادی تھی بلکہ وہ یتیم تھی اور ماموں کے گھر رہا کرتی تھی اس کی تعلیم کا خرچہ وظیفوں پر تھا مگر اس کا دل بہت سخی تھا وہ بے وقوف تھی حماقتیں کرتی تھی لیکن اس کے باوجود اس پر پیار آتا تھا۔

عالیہ کو اس کی خالہ نے بلایا اس نے سوچا کہ رضیہ جو خالہ کی اکلوتی بیٹی ہے اس نے ہی کوئی حرکت کی ہوگی رضیہ نادر کو پسند کرتی ہے اور اس سے شادی کی خواہشمند ہے لیکن رضیہ کی ماں مخالفت کر رہی تھی اور بیٹی کو سمجھا رہی تھی کہ اس کی نظر جائیداد پر ہے لیکن وہ نہیں مانتی۔عالیہ تم ہی اس کو سمجھاؤ یہ تمہاری بات ہی مانتی ہے۔ سارا ماجرا سن کر عالیہ نے کہا کہ خالہ جان نادر میں کیا برائی ہے کہ آپ انکاری ہیں۔اس کے بعد عالیہ نے رضیہ کی ماں یعنی خالہ جان کو خاصا سمجھایا کہ رشتہ قبول کر لیں لیکن وہ نہ مانی اور نادر کو برا بھلا کہنے لگیں کہ وہ ہماری جائیداد پر نظریں جمائے ہوئے ہے عالیہ کی سمجھ میں یہ بات آئی کہ واقعی ایسا ہو سکتا ہے لیکن رضیہ کو سمجھانا ایک مشکل کام تھا کیونکہ وہ نادر کے بغیر اپنی زندگی کو ادھورا سمجھ رہی تھی۔اس نے عالیہ سے کہا کہ ہم نادر نہیں جی سکتے ہیں تھوڑا سا زہر ہی لا دو ہم جینا نہیں چاہتے۔عالیہ نے رضیہ کو تسلی دی کہ ایسا نہ کہو ہم ایک مرتبہ پھر خالہ جان کو سمجھائیں گے لیکن خالہ جان نے بھی عالیہ سے یہ ہی کہہ دیا کہ مجھے زہر لا دو عالیہ دونوں ک باتیں سن کر پریشان ہو گئی سو چا رضیہ کو بھاگنے کا مشورہ دیا جائے لیکن خاندان کی عزت خراب ہو گی بہرحال عالیہ نے مشورہ دیا کہ وہ بھاگ جائے اس کے سوا کوئی صورت نہیں۔رضیہ نے اقرار کیا کہ اگر وہ بھاگ جائے تو جائیداد سے مکمل طور پر ہاتھ دھونا پڑیں گے۔عالیہ نے کہا اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ اگر تم نادر سے محبت کرتی ہو تو سب کچھ برداشت کرنا ہو گا۔تمام عیش و عشرت کو ٹھکرانا پڑے گا۔

عالیہ یتیم تھی ایسا عیش و عشرت انہیں کہاں ملا جو رضیہ کے حصہ میں آیا۔آگے چل کر ہم دیکھتے ہیں کہ رضیہ کسی طرح نہ مانی تو اس کی مانے عالیہ سے کہا کہ اگر یہ نہیں مانتی تو تم نادر کو ہی سمجھاؤ کہ وہ رضیہ کا ساتھ چھوڑ دے عالیہ اس پر راضی ہو گئی نادر کو سمجھایا وہ نہ مانا اور کہنے لگا کہ یہ سب جہالت کے دور کی باتیں ہیں وہ دور اب گزر چکا ہے جب والدین اولاد پر ظلم کیا کرتے تھے۔اس کے بعد اُس نے عالیہ سے سوال کیا کہ آپ رضیہ کی کون ہیں اس نے کہا میری کلاس میٹ ہے اور بہن سے بڑھ کر ہے نادر بولا اب سمجھا عالیہ نے کہا کہ آپ رضیہ کو بھلانے کی کوشش کریں گے اس نے کہا ہاں میں ان کی والدہ کی خوشی کے لئے ایسا کروں گا۔دوسرے یہ رضیہ

M.HARIS BASIM

ابھی کم سن ہے بُرے بھلے میں تمیز نہیں کر سکتی نادر نے پھر سوال کیا کہ آپ مجھے اور رضیہ کو جدا کرنا چاہتی ہیں آپ کو کیا حاصل ہوگا۔ وہ میری اچھی دوست ہے آپ ایک شریف انسان ہیں مگر نکمے ہیں رضیہ کی جائیداد پر آپ کی نظر ہے اسے غصہ آ گیا اُس نے عالیہ کو کھری کھری سنا دی۔ عالیہ سب سنتی رہی۔ پھر نادر کہتا ہے کہ اچھا میرا اور رضیہ کا کوئی جوڑ نہیں تو میرا اور آپ کا تو جوڑ ہے عالیہ اس صورتحال سے بوکھلا سی گئی اور سوچنے لگی کہ کوئی نہایت ڈھیٹ انسان ہے رضیہ کی جان بچی تو اب میرے پیچھے پڑ رہا ہے۔ پس نادر رضیہ کو چھوڑ کر عالیہ کے پیچھے لگ جاتا ہے اور مختلف دھمکیاں دیتا ہے کہ اگر عالیہ نہ مانی تو وہ جان دے دے گا۔ دریا میں کود جائے گا۔ نادر عالیہ کا جانی دشمن ہو رہا ہے۔ اب وہ ان کے گھر بھی آتا جاتا ہے ماموں ممانی (جہاں عالیہ رہتی ہے) اُسے کچھ نہیں کہتے مختصر یہ کہ وہ عافیہ سے رشتہ کا خواہشمند ہے اور اس نے ماموں کو پیغام بھی دیا ہے انہوں نے کہا ہے کہ وہ عالیہ سے پوچھ کر کوئی جواب دیں گے مگر وہ کہتا ہے کہ میں نے ان کی رضامندی حاصل کر لی ہے۔ عالیہ یہ سب سن کر پریشان ہو جاتی ہے اور رونے لگتی ہے کہ فضول کی مصیبت میرے پیچھے لگ گئی ہے۔ مصنفہ کہتی ہے کہ عالیہ دو دن بعد کالج آئی لیکن ان کی حالت درست نہ تھی مختصر یہ کہ نادر نے عالیہ سے شادی کر لی اور بغیر بتائے نوکری کے لئے مڈل ایسٹ چلا جاتا ہے عالیہ کو کچھ خبر نہیں ہوتی اس لئے وہ رو رہی ہے اور کہہ رہی ہیں میرے ساتھ دھوکہ ہوا ہے میں کیسے صبر کروں میں کہیں منہ دکھانے کے قابل نہ رہی۔ خالہ جان مجھ سے الگ ناراض ہیں اور مجھے سخت بُرا بھلا کہہ رہی ہیں اس انسان کی چالاکی دیکھو کہ ماموں تک کو کچھ نہ بتایا کہ وہ مڈل ایسٹ نوکری کرنے جا رہا ہے۔ دوسری طرف منیر میاں جس سے رضیہ کا رشتہ طے تھا کسی فرنگن سے شادی کر لی۔ اب خالہ جان پچھتا رہی ہیں اور مجھے الزام دے رہی ہیں کہ میں نے ہی رضیہ کے منگیتر نادر کو بہکایا اور خود اسے پھانس کر اس سے شادی کر لی۔ عالیہ سب حال سنا کر مسلسل روتی رہی۔ امتحان ختم ہو چکے تو ان کا جانی دشمن یعنی نادر انہیں مڈل ایسٹ لے گیا۔

سیاہ و سفید

(غلام عباس)

''سیاہ و سفید'' یہ افسانہ غلام عباس نے تحریر کیا ہے اس افسانے میں غلام عباس نے مڈل اسکول کی ایک استانی میمونہ کی داستان بیان کی جس کی ایک چھوٹی بہن بھی ہے والدین کا انتقال ہو چکا ہے وہ لاہور کے قریب ایک قصبے کے زنانہ اسکول میں استانی ہے اور اسی اسکول کے بورڈنگ ہاؤس میں رہتی ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے اس افسانے میں یہ وضاحت کی ہے کہ پردیس میں تنہا عورت کے باہر نکلنے اور سیر و تفریح کرنے میں خاصی مشکلات ہیں اور تنہا عورت ان مشکلات کا سامنا نہیں کرتی۔

افسانہ کچھ اس طرح شروع ہوتا ہے کہ مڈل اسکول کی استانی میمونہ آئینے کے سامنے کھڑی اپنے بال سنوار رہی ہے اور سوچ رہی ہے کہ میں نے جو رقم اپنی قلیل آمدنی سے بچا کر جمع کی ہے اس سے کون سا زیور بناؤں۔ اچانک اسے آئینے میں اپنے سفید بالوں کی ایک لٹ نظر آ جاتی ہے اور خیالوں کا سلسلہ ٹوٹ جاتا ہے۔ ساتھ ہی اُسے شدت سے احساس ہوتا ہے کہ وہ بوڑھی ہوتی جا رہی ہے۔

میمونہ کا باپ ایک غریب ٹیچر یا استاد تھا۔ اس کی ایک چھوٹی بیٹی ساجدہ بھی تھی۔ اس نے مرنے سے قبل اپنی ان دونوں بیٹیوں کو اس قابل بنا دیا تھا یعنی پڑھا لکھا دیا تھا کہ یہ تعلیم بُرے وقت میں ان کے کام آئے۔ چھوٹی بیٹی کی شادی باپ کے سامنے ہوگئی لیکن بڑی بیٹی کی شادی ہونے سے قبل ہی وہ اس دنیا سے رخصت ہو گئے لیکن انہوں نے مرنے سے قبل میمونہ کو لاہور کے قریب کے قصبے کے زنانہ اسکول میں استانی کی جگہ دلوا دی تھی۔ اس کی تنخواہ ۳۵ روپے ماہانہ تھی اور وہ اسی اسکول کے بورڈنگ ہاؤس میں رہتی تھی۔ وہ دن بھر اسکول میں مصروف ہوتی چھٹی ہوتی تو واپس بورڈنگ ہاؤس آ جاتی اس کے علاوہ اس کی کوئی مصروفیات نہ تھیں۔ پس کبھی کبھار شام کو وہ دوسری استانیوں کے ساتھ اسکول سے باہر چہل قدمی کو نکل جاتی مگر اسے دیہات کا ماحول دیکھ کر اس سیر میں مزا نہ آتا وہ کبھی کبھی اس زندگی سے بیزار ہونے لگتی لیکن پھر سوچتی کہ شاید کوئی بہتری کی صورت نکل آئے اسی طرح دس سال گزر گئے۔ وہ زندگی کے ان حالات سے پریشان تھی جس میں کوئی لطف یا مزا نہ تھا۔ کرسمس کی چھٹیاں قریب تھیں۔ ان چھٹیوں سے تقریباً ایک ہفتہ قبل اس کی بہن ساجدہ کا اسے خط ملا یہ خط کئی سال بعد آیا تھا ساجدہ نے لکھا تھا کہ اس کے میاں کا تبادلہ دہلی ہو گیا ہے وہ نئی دہلی کے ایک سرکاری کوارٹر میں رہتے ہیں اس نے دہلی کے تمام اہم مقامات کا ذکر کیا اور آخر میں لکھا کہ تم کرسمس کی چھٹیوں میں میرے پاس آ جاؤ

M.HARIS BASIM

مجھ سے مل بھی لینا اور میں تمہیں دلی کی سیر کراؤں گی۔

میمونہ جو زندگی کی یکسانیت سے عاجز تھی موقع غنیمت جانا اور فوراً دہلی جانے کا اِرادہ کرلیا۔سفرِ خرچ کے لئے اس کے پاس ۵۰ روپے تھے اس نے بہن کو لکھ دیا کہ وہ فلاں تاریخ کو آرہی ہے۔روانہ ہونے سے ایک روز قبل اس نے ضروری خریداری کی اور بہن کے لئے بھی گفٹ خریدا تمام سفری تیاری مکمل کر کے وہ روانہ ہوگئی۔اس کا یہ ریل کا پہلا سفر تھا لیکن وہ پریشان نہ تھی اسے اس سفر میں ایک لطف آرہا تھا جب تک گاڑی روانہ نہ ہوئی وہ کھڑکی سے برابر پلیٹ فارم کی سیر دیکھتی رہی۔ اسے یہ سماں بہت اچھا لگ رہا تھا۔

اگلے روز وہ اپنی بہن کے گھر پر تھی ساجدہ کی شادی کے بعد دونوں بہنوں کی یہ پہلی ملاقات تھی ساجدہ نے اپنا حال احوال بتایا بچوں کے بارے میں بتایا کہ اس کی تین لڑکیاں اور دو لڑکے تھے پھر ان کی عمریں بتائیں اور نئے آنے والے بچے کی نوید سنائی۔اس کے بعد ہر بچے کی پیدائش پر مسائل' بچوں کی عادتوں' ذہانت و شرارت بیماری سب کے بارے میں میمونہ کو بتایا آخر میں اُس نے اپنی معاشی بدحالی کا ذکر کر دیا لیکن ساتھ ہی بہن سے کہا کہ میرے میاں نے کسی دوست کو روپے قرض دے رکھے ہیں جیسے ہی وہ رقم ملی ہم ٹیکسی لیں گے اور تمہیں دلی کی سیر کرائیں گے لیکن جب دو دن گزر گئے تو میمونہ نے خود اپنے خرچے پر ٹیکسی منگوائی اور اس میں بیٹھ کر سب لوگ دلی کی قابلِ دید مقامات دیکھنے گئے لیکن بچوں کے شور شرابے کی وجہ سے میمونہ کو اس میں لطف نہ آیا۔اگلے دن وہ اداس تھی بہن نے اسے اداس دیکھ کر اپنے صاحب سے کہا کہ تمہیں معلوم ہے کہ میں پیدل نہیں چل سکتی تم جا کے ذرا میمونہ کو کناٹ پیلس کی سیر کرالاؤ وہ راضی ہوگیا اور میمونہ کو لے کر کناٹ پیلس چلا گیا اس کے ہمراہ اس کی بڑی بیٹی قمر النساء بھی تھی۔میمونہ یہاں کی رونق' وسیع الشان عمارتیں' دکن کی سج دھج' سینما گھروں کی گہما گہمی ہوٹلوں اور قہوہ خانوں میں بلند ہونے والے قہقہے' پارکوں کی رونق' مشرقی اور مغربی آرٹ کے نمونے اور رنگ برنگی ساریوں والی لڑکیوں کے جھرمٹ کو دیکھ کر حیرت زدہ ہوگئی وہ یہ سب کچھ ایک محویت کے عالم میں دیکھ رہی تھی۔دہلی آنے پر اسے جو کوفت ہوئی تھی اس کا خیال ایک دم نکل گیا تھا۔لڑکیوں کو کسی مرد کی سرپرستی کے بغیر آزادانہ اور دلیری سے پھرتے دیکھ کر اسے حیرت بھی تھی اور خوشی بھی۔کچھ دیر سیر کرنے کے بعد دونوں نے قہوہ خانے میں قہوہ پیا اور پھر گھر کی راہ لی۔

بہن نے پوچھا پسند آیا کناٹ پیلس اس نے کہا بہت اچھا مقام ہے دوسرے دن بہنوئی کو کچھ کام تھا میمونہ تیار ہوئی اور اکیلی سیر کرنے نکل گئی وہ سیدھی کناٹ پیلس پہنچی وہ کچھ دیر مختلف جگہوں کی سیر کرتی رہی اچانک ایک نوجوان تیز قدم اٹھاتا ہوا اس کی طرف دیکھے بغیر اس کے پاس سے گزر گیا۔میمونہ وہاں سے چل دی اور جہاں دکانیں قطار میں تھیں وہ ایک قطار کی طرف زیادہ روشنی دیکھ کر چل دی کہ وہی نوجوان پھر اُسے اپنی سمت آتا دکھائی دیا وہ اس کا مسلسل پیچھا کر رہا تھا۔یہ ماجرا کئی بار پیش آیا کبھی وہ آگے چلنے لگتا اور کبھی میمونہ کو آگے چلنا پڑتا۔اس نے سوچا ذرا دیکھوں کہ یہ نوجوان واقعی میرا پیچھا کر رہا ہے یا میرا محض شک ہے۔وہ ایک چینی آرٹ کی دُکان میں داخل ہوگئی جب باہر نکلی تو وہ نوجوان باہر ہی مل گیا دونوں کی نگاہیں ملیں تو اس نے اشارے سے سلام کیا۔یہ حرکت غیر متوقع تھی اس لئے میمونہ ہنس دی اور اپنے گھر کی طرف چل دی۔وہ اس واقعہ پر شاید خوش تھی۔خوشی خوشی کھانا کھایا بچوں سے باتیں کیں آج بچے اسے ایک دم اچھے لگنے لگے تھے۔

اگلے دن سہ پہر کو میمونہ پھر تیار ہو کر اور اپنی سب سے قیمتی ساڑھی پہن کر سیر و تفریح کے لئے تنہا نکل کھڑی ہوئی آج یہ اچھی طرح بنی سنوری تھی بال بھی نئے انداز میں سیلون سے بنوائے تھے۔وہاں سے تیار ہو کر وہ کناٹ پیلس کے پارک کی طرف چل دی۔تھوڑی دیر پارک کے مختلف حصوں کی سیر کرتی رہی۔اس کے علاوہ مختلف جگہوں پر گھومی پھری لیکن وہ نوجوان اسے کہیں نظر نہ آیا وہ قہوہ خانے گئی قہوہ منگوایا آدھے گھنٹے بعد وہاں سے نکل آئی رات خاصی ہو چکی تھی اور سردی بھی زیادہ تھی اس نے ایک سیلون کار میں کئی نوجوان کو کار سے باہر باتیں کرتے دیکھا اس میں کل والا نوجوان بھی تھا جیسے ہی اس کی نظر میمونہ پر پڑی وہ کچھ گھبرا سا گیا پھر اس نے اپنے ساتھیوں کو اشارہ کیا سب کے چہرے ایک دم اشتیاق سے چمک اٹھے مگر بظاہر انہوں نے میمونہ کی طرف توجہ نہ دی اور آپس میں باتیں کرتے رہے۔

میمونہ نے ان کی حرکات نوٹ کر لیں تھیں وہ غصہ میں آگئی اور حقارت سے بولی اوہ یہ بات تھی! جب وہ ذرا دور نکل گئی تو وہ نوجوان بھی میمونہ کی سمت چلنے لگا۔ میمونہ نے اسے دور سے ہی دیکھ لیا تھا اس کا انداز بالکل بدلا ہوا اور مناسب نہ تھا۔میمونہ کو آج اس نوجوان میں کوئی خاص بات نظر نہ آرہی تھی وہ ایک عیار و مکار اور چالاک انسان تھا۔اسے یقین تھا کہ جب وہ اس کے پاس سے گزرے گا تو یہ ضرور کوئی حرکت کرے گا مگر اس نے موقع ہی نہ دیا لیکن اچانک وہی سیلون سیاہ کار اس کو آتی دکھائی دی اس میں چار آدمی سوار تھے وہ گھبرا گئی کیونکہ یہ کار اسی کا پیچھا کر رہی تھی۔وہ وحشت زدہ ہوگئی اور اپنے آپ کو بُرا بھلا کہنے لگی پردیس کا معاملہ تھا اور اس کی عزت خدا کے ہاتھ میں تھی۔میمونہ نے ہمت نہ ہاری وہ نوجوان مسلسل ایک اس کے ساتھ ساتھ چلتا رہا اور ایک وقت ایسا آیا کہ اس نوجوان نے اس کا راستہ روک لیا اور اس نے کہا کہ

میرا راستہ چھوڑ دو وہ نوجوان دبک کر ایک طرف ہو گیا۔

رات آٹھ بجے کا وقت تھا اور وہ اس کناٹ پیلس کے چکر سے نکل کر اس بڑی سڑک پر پہنچ گئی تھی جو سیدھی اس کے بہنوئی کے کوارٹر کو جاتی تھی۔ نوجوان نے جب ہ دیکھا کہ اُسے اپنے مقصد میں ناکامی ہو رہی ہے تو زیادہ سرگرمی سے اس کا پیچھا کرنے لگا اور اوچھی حرکتوں پر اُتر آیا اور میمونہ کو نہ جانے کیا کچھ بکتا رہا۔ لیکن میمونہ نے ایک نہ سنی اور اپنی رفتار مزید بڑھا دی۔ دوسری طرف وہ سیاہ کار اس کا پیچھا کر رہی تھی وہ اس کے قریب آئی اور اس کے اندر سے آواز آئی کہ پیدل کب تک چلیں گی کار میں تشریف لے آیئے۔ لیکن میمونہ نے ایک نہ سنی اور گھر پہنچ کر ہی دم لیا۔ وہ اس واقعہ سے خاصی گھبرائی ہوئی تھی۔ چنانچہ ۳۱ دسمبر کو اُس نے واپسی کی راہ لی اور افسوس کرنے لگی کہ میں نے بلاوجہ اپنا پیسہ ضائع کیا اگر ان پیسوں کا کوئی زیور بنا لیتی تو بُرے وقت میں کام آتا۔ پس وہ بددل ہو کر واپس بورڈنگ ہاؤس آ گئی اسے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ پانچ سال مزید بوڑھی ہو گئی ہے۔

مرکزی خیالات

در ہجو اسپ (گھوڑے کی برائی میں)

حوالۂ شاعر

مرزا رفیع سودا کو قصیدے کا شہنشاہ کہا جاتا ہے۔ آپ میر تقی میرؔ کے ہم عصر تھے اور اپنے دور میں آپ کو بھی میر تقی میرؔ کی طرح استاد کا مرتبہ حاصل تھا۔ سودا کی انفرادیت وحوالوں سے مسلمہ ہے پہلی تو یہ ہے کہ آپ نے قصیدے کی صنف کو ہجو نگاری سے روشناس کرایا اور دوسری یہ کہ مرثیہ نگاری کو اردو شاعری میں ایک باقاعدہ اسلوب فراہم کیا۔ آپ کی غزل بلند آہنگی پر انحصار کرتی ہے اور اس میں خیال کے اظہار کے لیے اپنے زمانے کے مسلمہ تلازمات سے انحراف دکھائی دیتا ہے لیکن روانی اور برجستگی کے معاملے میں سودا اپنے عہد کی روایت سے جڑے ہوئے آدمی ہیں۔ سودا بیش بہا ذخیرہ الفاظ کے مالک تھے جس کی بناء پر شاعری کی کسی بھی صنف میں طبع آزمائی پر قادر تھے۔

مرکزی خیال

یہ نظم قصیدے کے شہنشاہ مرزا رفیع سودا کی مشہور ہجو ''تضحیک روزگار'' کا اقتباس ہے بظاہر یہ ایک گھوڑے کی ہجو ہے جس میں اسے برا بھلا کہا گیا ہے لیکن دراصل یہ اس زمانے کے خراب معاشی اور فوجی نظام پر کی گئی بھپتی ہے اس میں فوج کے نکمے' کمزور' بزدل سپاہیوں اور ضروری سہولتوں کی عدم موجودگی کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ سودا اس نظم میں یہ بتانا چاہتے ہیں کہ سوسائٹی کی معشی حالت اس قدر بدتر ہے کہ رئیس ترین لوگ مفلسی کی انتہا پر پہنچ گئے ہیں جبکہ کچھ مالدار لوگ ایسے بھی ہیں جو کنجوسی کی بدولت بھوکوں مر رہا ہے اور کوئی اس کا پرسانِ حال نہیں یعنی سودا کی ہجو میں پیش کردہ یہ گھوڑا اس زمانے کی شکست وریخت کی علامت ہے۔

کل نفسٍ ذائقۃ الموت

حوالۂ شاعر

نظیر اکبر آبادی کو اردو کا عوامی شاعر کہا جاتا ہے جس کی وجہ ان کی شاعری کے عوامی موضوعات اور ان کے اظہار کے لیے استعمال ہونے والی عوامی زبان ہے۔ نظیر نے اردو نظم نگاری کو جن مضامین سے روشناس کرایا وہ زندگی کا اٹوٹ انگ تو تھے لیکن شعراء نے انہیں شاعری کا حصہ بنانے کی جرأت نہیں کی تھی۔ یہ نظیر ہی کی ہمت تھی جس نے نہ صرف انہیں شاعری کا حصہ بنایا بلکہ اس حد تک روانی بخشی کہ یہ تمام مضامین آگے چل کر محاورے بن گئے آپ کی ان زبان زدِ عام نظموں میں آدمی نامہ و بنجارہ نامہ' ہنس نامہ اور برسات کی بہاریں وغیرہ اہم ہیں۔ نظیر اپنی طرز کے ایک زود گو شاعر تھے جن کے مزاج میں جدت پسندی اور تنوع بہت زیادہ تھا اس بناء پر انہوں نے عام سے مضامین کو محض اپنے طرزِ بیان سے نیا پن اور تنوع بخشا اور یہ نظمیں دو صدیاں گزر جانے کے باوجود معاشرے میں اپنے اثرات رکھتی ہیں اور وقت

M.HARIS BASIM

کے ساتھ ساتھ یہ تاثر اور گہرا ہوتا جا رہا ہے۔

مرکزی خیال

اس نظم میں نظیر اکبر آبادی نے موت جیسی لازوال حقیقت کی تفصیل بیان کی ہے اور یہ بتایا ہے کہ زندگی ایک فریب ہے جو مختلف روپ میں آدمی کو موت کی حقیقت سے دور کرنے کی کوشش کرتا ہے یا یوں کہیں کہ جتنے روپ آدمی کے ہیں اتنے ہی روپ زندگی کے ہیں مگر موت کا ایک ہی رویوں کی تفصیل کے ذریعے نظیر نے اس نظم میں موت کی حقیقت باور کرانے کی کوشش کی ہے۔

اذان

حوالۂ شاعر

علامہ اقبال اردو شاعری کی روایت میں اس قافلے کے سالار ہیں جن کے ہاتھ میں نظم نگاری کا پرچم ہے۔ آپ نے جدید نظم نگاری کو غزل کی روایت سے ہم آہنگ کیا جس میں فلسفے کی آمیزش نے انفرادیت پیدا کر دی۔ علامہ اقبال کی شاعری کا ایک اور وصف تلمیح نگاری ہے۔ انہوں نے اپنے اشعار میں مشہور تاریخی واقعات کو زمانہ حال پر منطبق کیا۔ آپ نے اپنی نظموں میں ایسے استعارے متعارف کرائے جو آگے چل کر معاشرے کی اصلاح کا کلیہ قرار پائے مثلاً نوجوانوں کے لیے شاہین کا استعارہ اپنے اندر بے ساختگی کے ساتھ ساتھ بھرپور جامعیت لیے ہوئے ہے۔ علامہ اقبال نے بچوں کے لیے بھی بہت سی نظمیں تخلیق کیں۔ آپ نے اردو کے علاوہ فارسی میں بھی شاعری کی اور اس زبان میں بھی اقبال نے وہی چابکدستی دکھائی جو ان کی اردو شاعری کا خلاصہ ہے۔

مرکزی خیال

اس نظم میں علامہ اقبال نے انسان اور بالخصوص مسلمانوں سے تخاطب ہوتے ہوئے کہا ہے کہ دن اور رات دونوں علیحدہ علیحدہ فطری تقاضے رکھتے ہیں اور یوں تو دونوں ہی انسان زندگی میں اہمیت کے حامل ہیں لیکن اگر الگ الگ دونوں کی صفات دیکھی جائیں تو ان کے اثرات واضح طور پر انسانی زندگی میں دیکھے جاتے ہیں مثلاً رات کے سکوت میں خدا سے رابطہ بحال کرنا اور عبادات کے ذریعے اپنے باطن پر قبول کرنا دن کے ہنگاموں کی نسبت کہیں بہتر ہے کہ جبکہ صبح کی اذان اس بات کا اعلان ہوتی ہے کہ روزگار زمانہ آچکا ہے اور اے انسان اپنے رزق اور مقاصد کی تلاش میں سرگرداں ہو جا۔

----XXX----

نثر نگاری پر تبصرے

اُردو ادب میں سرسید احمد خان کا مقام

سرسید احمد خان نے اردو ادب اور اس کی نشو و نما میں نمایاں حصہ لیا ہے اور اردو زبان کی ترقی و ترویج کیلئے ان کے کارنامے سنہری حروف میں لکھے جانے کے قابل ہیں۔ سرسید سے پہلے مضمون و معنی کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں دی جاتی تھی، بلکہ عبارت آرائی اور طرزِ بیان کی خوبصورتی، ثقیل الفاظ اور مقفیٰ و مسجع عبارت لکھنا قابلیت کی دلیل سمجھا جاتا تھا۔ چنانچہ آپ نے اردو نثر کو سلاست، سادگی اور روانی کے زیور سے آراستہ کیا اور مقصدیت پر زور دیا۔ آپ سے پہلے غالب اس علم کو بلند کر چکے تھے اسی لیے سرسید احمد خان پر غالب کی نثر نگاری کا اثر غالب ہے اور مکالمہ نگاری کا فن سرسید نے غالب ہی سے لیا ہے۔ غالب نے اردو بول چال کا بے تکلف انداز اپنے خطوط میں اپنایا مگر سرسید نے اسی علمی اور ادبی مقاصد کے لئے اس طرح استعمال کیا ہے کہ اس نے باقاعدہ تحریر کی شکل اختیار کر لی۔ یہ اندازِ تحریر دراصل وہ تحریک تھی جس کا سہرا اردو ادب کے ارکانِ خمسہ (سرسید، آزاد، نذیر احمد، حالی، شبلی) کے سر ہے۔ اس کی خصوصیت سلاست، سادگی، روانی اور مقصدیت پر مبنی ہے یعنی "ادب برائے زندگی"۔

M.HARIS BASIM

اس تحریک کی بناء پر اردو نثر اس قابل ہوگئی ہے کہ وہ علمی، تاریخی، تہذیبی، سائنسی اور ثقافتی موضوعات پر بلاتکلف اظہارِ خیال کے لیے استعمال کی جا سکے۔ سرسید ہی نے اردو نثر کو مضمون نگاری (Essay Writing) سے بھی روشناس کرایا۔ وہ اردو میں اس صنف کے بانی ہیں۔ یہ مضامین "تہذیب الاخلاق" میں شائع ہوئے تھے۔ آپ نے ان سے اصلاح کا کام لیا ہے۔

سرسید احمد خان وہ پہلے نثر نگار ہیں جنہوں نے اُردو نثر کو انگریزی طرزِ فکر اور اسلوبِ نگارش سے روشناس کرایا ہے۔ تہذیب الاخلاق نے اردو ادب میں ایک عظیم انقلاب برپا کیا جس کی بناء پر اردو نثر کی مختلف اصناف معرضِ وجود میں آئیں اور یہ کہنا بالکل بجا ہے کہ **جدید علمی نثر کا آغاز سرسید احمد خان سے ہوتا ہے۔**

قدیم ادب اور شاعری سے سرسید کو شکایت تھی کہ وہ زندگی کی ترجمانی کرنے سے قاصر ہے اور شاعر کی زبان سے نکلنے والی بات دوسروں کے دل میں اترنے سے محروم رہتی ہے چنانچہ **از دل خیزد بر دل ریزد** کے مطابق مولانا حالؔی سے اپنے اس نظریہ کو علمی جامہ پہنانے کیلئے مسدس حالی (مدّ و جزر اسلام) لکھوائی جو ایک محرکۃ الآرا نظم ہے اور جسے سرسید احمد خان آخرت میں اپنے لیے زریعہ نجات تصور کرتے تھے۔

سرسید احمد خان کے اسلوبِ تحریر کی خصوصیات

اُردو ادب میں سرسید کی شخصیت بڑی قد آور ہے وہ ایک صاحبِ طرز ادیب، انشاء پرداز اور مصلح قوم ہیں۔ انہوں نے اردو میں محقولات یعنی فلسفہ کو متعارف کرایا ہے۔ ان کی تحریر میں ایک باوقار ادیب کی انفرادیت پوری طرح نمایاں ہے۔ آپ ایک جدید تحریک کے بانی اور داعی تھے اس لیے ان کا میدان عمل تقریر ہی تک محدود نہ تھا۔ انہوں نے تحریر کے زریعہ اپنا مشن قوم تک پہنچایا ہے۔ ان کی تحریر ان کے مقصد کا زریعہ تھی جس کی چند ایک نمایاں خصوصیات مندرجہ ذیل ہیں:

1۔ سادگی

آپ سے پہلے اردو نثر سجع بندی اور قافیہ پیمائی کا شکار تھی۔ مقصدیت پر الفاظ سازی کو فوقیت حاصل تھی۔ آپ نے اس اندازِ تحریر کو ترک کر کے سادگی، سلاست، روانی اور عام فہم روش اختیار کی اور ایسی متاثر کن نثر کو رواج دیا کہ جس کے لیے یہ کہنا قطعی مناسب ہے کہ "دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے۔۔۔۔" آپ نے مختلف موضوعات پر قلم اُٹھایا اور کمال یہ ہے کہ ہر موضوع اور موقع کے لیے اس کے مناسب زبان و بیان کا سادہ انداز اپنایا۔ چنانچہ ان کی تحریروں میں عام بول چال کا انداز نمایاں ہے۔ مثلاً وہ لکھتے ہیں:

''اے ہمیشہ زندہ رہنے والے امید! جبکہ زندگی کا چراغ ٹمٹماتا ہے اور دنیاوی آفتاب اب بام ہوتا ہے، ہاتھ پاؤں میں گرمی نہیں رہتی، رنگ فق ہو جاتا ہے، منہ پر مردنی چھا جاتی ہے، ہوا میں ہوا، پانی میں پانی، مٹی میں مٹی ملنے کو ہوتی ہے، تو تیرے ہی سہارے وہ کٹھن گھڑی آسان ہوتی ہے۔۔۔۔۔ وہ ایمان کی خوبصورت بیٹی ہے جس کا پیارا نام **امید** ہے''۔

2۔ مقصدیت

سرسید احمد خان نے جو کچھ لکھا کسی نہ کسی اصلاحی کام اور مقصد کے تحت لکھا۔ اس لیے انہوں نے عبارت آرائی اور حسنِ بیان کی طرف توجہ نہیں دی بلکہ مدعا نگاری اور اصل مواد کی طرف ان کا خیال ہمیشہ رہا ہے وہ جو کچھ بھی لکھتے ہیں اس کے معنی دوسروں تک پہنچانے کی کامیاب کوشش کرتے ہیں اور اس کے لیے پھر بھی بے چین رہتے ہیں بقول مولانا حالؔی:

"سرسید کی حالت اس بے قرار آدمی کی طرح تھی جو گھر میں آگ لگی دیکھ کر بیتابانہ ہمسایوں کو آگ بجھانے کے لیے پُکارتا ہو۔"

غرض کہ قومی اصلاح کا مقصد ان کے ہمیشہ پیشِ نظر رہتا، زبان و بیان کی آرائش ان کی نگاہ میں ثانوی حیثیت رکھتی تھی اور یہی ان کا اپنا اسلوبِ تحریر ہے۔

3۔ بے ساختگی

سرسید کی تحریر ہر قسم کی بے جا رنگینی اور بناوٹ سے پاک ہے۔ وہ خیالات کا اظہار عام بول چال کی فطری زبان میں کرتے ہیں۔ جن میں جذبات کی سچائی دلوں میں اُتر جاتی ہے۔ لیکن یہ بے ساختگی حالؔی اور شبلؔی کی سی بے ساختگی نہیں ہے۔ وہ زبان و بیان کے قواعد نظر انداز کر دیتے ہیں نیز انگریزی الفاظ بکثرت استعمال کرتے ہیں حتیٰ کہ عامیانہ اور بازاری الفاظ بھی استعمال کر ڈالتے ہیں یہی سبب ہے کہ ان کی تحریروں میں ادبی حسن کی کمی پائی جاتی ہے اور ان کی بے ساختگی کا اپنا حسن ہے جس میں شبلؔی جیسے چٹخارے اور حالؔی جیسی ادبی شان قطعی نہیں ہے۔

W.HARIS BASIM

4۔ استدلالیت

سرسید نے اپنی تحریروں میں جذبات سے زیادہ عقل کو اہمیت دی ہے۔ان کی تحریریں منطقی طور پر بہت مضبوط ہوتی ہیں۔انہوں نے نزاعی موضوعات پر قلم اُٹھا کر لوگوں کو قائل کرنے کی کوشش کی ہے اس لیے ان کے طرزِ تحریر میں مناظرانہ انداز بھی موجود ہے جس نے ان کی تحریر کو استدلالی اور خطیبانہ انداز بھی دیا۔

5۔ مزاح اور ظرافت

مزاح اور ظرافت آپ کی فطرت کا خاصہ تھا جو برمحل استعمال کرتے اور اس خصوصیت نے آپ کی مضمون نگاری کو خیاری بنا دیا۔ان کے مزاح کا حسین انداز ہوتا اور موقع محل کے اعتبار سے بڑے خوبصورت طنزیہ صورت میں استعمال کرتے اس طنز و مزاح سے وہ اپنے موضوع اور تحریر یا تقریر کی متانت کو ہرگز مجروح نہ ہونے دیتے اور اس طرح ان کی ظرافت بھی مقصدیت کی پابند ہے۔

6۔ مصلحانہ انداز

ایک ادیب کے لیے ضروری ہے کہ وہ ادب کے تقاضوں کو نظر انداز نہ کرے اسے پہلے **ادیب** اور **مصلح** بعد میں ہونا چاہے۔مگر سرسید احمد خان پہلے مصلح ہیں اور بعد میں ادیب۔یہی سبب ہے کہ ان کے اندازِ بیان پر **وعظ** کا انداز غالب ہوتا ہے۔اخلاقی اصلاح اور معاشرتی انقلاب ان کی تحریر کی خصوصیات کا حصہ ہیں۔

7۔ قدرتِ بیان

علمی مضامین عموماً مشکل اور خشک ہوتے ہیں کیونکہ پیچیدہ علمی مسائل کے لیے استعمال ہونے والی زبان اصطلاحات کے سبب مشکل اور غیر دلچسپ ہو جاتی ہے لیکن سرسید کی انشاء پردازی کا یہ کمال ہے کہ وہ علمی مسائل کو بھی محض اپنی قدرتِ بیان کی وجہ سے عام فہم اندازِ تحریر میں سادگی، سلاست اور روانی کے ساتھ اس طرح لکھتے ہیں کہ اس میں آسانی اور دلچسپی پیدا ہو جاتی ہے۔

8۔ طویل جملے

آپ کی تحریر میں ایک اضطراری کیفیت بھی پائی جاتی ہے اس کی وجہ سے ان کا اپنے مقصد سے گہرا لگاؤ ہے وہ اضطراری حالات میں قلم برداشتہ لکھتے چلے جاتے ہیں جس کی بناء پر جملے طویل ہوتے چلے ہیں اور لہجہ میں تیزی و درشتی آجاتی ہے۔

9۔ تراکیب کا بھدّا پن

سرسید کے عام بول چال کے انداز میں لکھنے کا شوق ان کی تحریر میں بعض اوقات بڑی بھدّی اور عامیانہ تراکیب سے ان کی ادبی تحریر میں ایسا سقم پیدا کر دیتا ہے جو ذوقِ سلیم کو گراں گذرتا ہے۔بعض اوقات وہ عربی و انگریزی کے الفاظ کو ملا کر لکھ ڈالتے ہیں جو غلط ہیں مثلاً اوصاف سیلزیشن وغیرہ۔۔۔اس خامی کا سبب یہ ہوسکتا ہے کہ ان کا طرزِ تحریر زیادہ تر صحافیانہ ہے اور اسلیے ایسا ہونا غالبً ناگزیر تھا۔

10۔ تمثیلی انداز

سرسید نے بعض اصلاحی مضامین تمثیلی انداز میں تحریر کیے ہیں جو بڑے اثر انگیز اور دلچسپ ہے مثلاً گذرا ہوا زمانہ اور امید کی خوشی وغیرہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔**امید کی خوشی** سے ایک نادر اقتباس ہے "اونورانی چہرے والی، یقین کی اکلوتی بیٹی، امید! یہ خدائی روشنی، تیرے ہی ساتھ ہے، تو ہی ہماری مصیبتوں کے وقت ہم کو تسلی دیتی ہے، تو ہمارے آڑے وقتوں میں ہماری مدد کرتی ہے۔۔۔۔۔تیرے ہی سہارے ہمارے خوابیدہ خیال جاگتے ہیں۔"

تنقیدی تجزیہ

مشہور نقاد مہدی آلا فادی کہتے ہیں۔سرسید نے ہمیشہ معاخرینِ ادب کی حوصلہ افزائی کی اِنکی با اثر شخصیت خاموش تصرف کے ساتھ دوسروں کی حوصلہ افزئی کرتی رہتی تھی۔

مہدی آلا فادی ایک اور جگہ سرسیّد کے متعلق یوں رقم طراز ہیں۔آزاد کی زبردست شخصیت گو ایک حد تک سرسید کی تبلیغ سے بے نیاز معلوم ہوتی ہے لیکن یہ کیا کم ہے کہ ہمعصری کی عزت انکو بھی حاصل تھی اور مذاقِ سخن کے لحاظ سے جو ادھر جھلک پڑے جو سرسید کے لٹریچر کا خاصۂ امتیازی تھا۔

M.HARIS BASIM

محمد حسین آزاد

ابتدائیہ

آزاد ایک بڑے ادیب، انشاء پرداز، نقاد، مورخ اور زبان داں ہیں۔ آزاد کی نثر نگاری کی ابتداء میں ان کے پیشِ نظر دو نمونے تھے۔

۱) قدیم طرزِ نگارش جو مقفیٰ و مسجع ہونے کے سبب دقیق و مشکل تھا

۲) سادہ و سلیس انداز نثر نگاری جو غالبؔ اور سرسید احمد خان کی آسان فہم اور بات چیت والی نثر تھی جس کا بنیادی مقصد **ادب برائے زندگی** تھا۔ آزاد نے ان دونوں طرزِ تحریر سے استفادہ کرتے ہوئے ایک الگ ہی اندازِ تحریر اختیار کیا جو نہ قدیم نثر نگاری کی طرح الفاظ کا چیستان تھا اور نہ ہی سرسید کی طرح سنجیدہ و سپاٹ۔۔ بلکہ قدیم و جدید کی آمیزش سے ایک نئے اسلوب کی بنیاد رکھی جس کے موجد بھی وہی ہیں اور خاتم بھی وہی۔ کیونکہ اس طرزِ تحریر کی مثال نہ ان سے پہلے ملتی ہے اور نہ بعد میں۔ اس کی تقلید کوئی کر سکا گویا یہ طرزِ نگارش قدرت کا ایک عطیہ تھا جس کی خصوصیت و یکتائی کا سہرا ان ہی کے سر ہے اور ہمیشہ رہیگا۔

مولانا آزاد اپنی ذات میں ایک انجمن تھے اور اپنی شاعرانہ و منفرد نثر نگاری میں وہ **شہرت عام اور بقائے دوام کے دربار میں** ایک بلند مرتبہ پر فائز ہیں۔ ان کی مندرجہ ذیل تصانیف مقبولِ خاص و عام ہیں اور ان کے احساسات و ذہنی اختراعات کا نمونہ ہیں:

۱۔ **آبِ حیات**

۲۔ **نیرنگِ خیال**

۳۔ **دربارِ اکبری**

۴۔ **سخندانِ فارس**

۵۔ **قصص الہند**

آزاد کے اسلوبِ نگارش کی خصوصیات

مولانا آزاد ایک صاحبِ طرز انشاء پرداز اور ادیب ہیں۔ اس اپنے طرزِ نگارش میں وہ یکتا ہیں، انکی نثر میں ایک ادبی شان پائی جاتی ہے اور ان کا ادب مقصدیت کے تابع ہیں، زبان و بیان کی رعنائی اور بانکپن، جدّت خیال اور دلکشی، لطافتِ طبع اور زورِ بیان سب ہی کچھ موجود ہے یعنی شوخی و ظرافت، دلفریبی و دلکشی کے ساتھ ساتھ رعنائی اور خیال آفرینی ایک طلسماتی کیفیت پیدا کر دیتی ہیں۔

1۔ شاعرانہ نثر

آزاد کی نثر کی سب سے بڑی خصوصیت ان کا شاعرانہ طرزِ تحریر ہے۔ گویا انہوں نے نثر میں شاعری کی ہے۔ شگفتہ و خوبصورت الفاظ، رنگین و برمحل تشبیہات و استعارات، نیز خوشنما تراکیب کا استعمال، جذباتی تاثرات و خیال آفرینی سے آزاد کی نثر میں شعر کی سی لطافت پیدا ہو جاتی ہے چنانچہ ایک قاری پر ان کی شاندار نثر کا جادو کا سا اثر ہوتا ہے اور وہ اس کے سحر میں گُم ہو جاتا ہے مثلاً وہ لکھتے ہیں کہ "جب مشرق کا شہسوار ستاروں کی فوج کو شکست دے کر، شعاع کا نیزہ ہاتھ میں نکلا" یا" مگر قلعہ کا پلّہ بھاری تھا کہ اتنے میں شام نے آ کر اندھیرے کی سپر بیچ میں رکھ دی۔"

2۔ سلاستِ زبان

آزاد کی نثر میں سلاست، الفاظ کا صوتی آہنگ، روانی، زبان کی لطافت، موزوں الفاظ، نازک خیالی، زبان و بیان کی رعنائی، بانکپن آپ اپنی مثال ہے۔ ان کی نثر حسن و دلکشی کا پیکر ہے مثلاً وہ لکھتے ہیں کہ "حضرت عشق نے شادی کی تھی، محبت کے قاضی نے نکاح پڑھایا تھا اس لیے دَم بھر کی جدائی گوارا نہ تھی"۔

3۔ خیال آرائی

آزاد کی تحریر میں خیال آرائی اپنے عروج پر ہے وہ اپنی پروازِ تخیل سے ایسی ایسی رنگیں گلکاریاں کرتے ہیں کہ قاری دم بخود رہ جاتا ہے یعنی وہ جب کسی خیالی مضمون پر قلم اٹھاتے ہیں تو ان کا قلم موتی برساتا چلا جاتا ہے ان کے اس طرز انشاء پردازی پر ان کے تصورات اور خیالات کی بلند پروازی غالب نظر آتی ہے اور نثر میں نظم کی سی وہ کیفیت پیدا ہو جاتی ہے کہ قلب و ذہن متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ آزاد اپنے انوکھے تصورات و تخیلات اور حسن بیان سے کام لیکر ایک ایسا اگارخانہ تیار کرتے ہیں کہ

M.HARIS BASIM

ان کی تحریر چلتی پھرتی اور ہنستی بولتی تصاویر کا روپ دھار کر قاری کو ایک رنگین اور متحرک فلم کی طرح متاثر کرتی ہے۔ان کی اس پیکر تراشی کی مثالیں آبِ حیات، نیرنگ خیال اور دربارِ اکبری میں بکثرت ملتی ہیں۔مثلاً:

" کبھی کبھی ایسا بھی ہو جاتا تھا کہ دونوں کا آمنا سامنا ہو کر سخت لڑائی آ پڑتی تھی۔اس وقت دروغ دیوزاد اپنی دھوم دھام بڑھانے کے لیے سر پر بادل کا دھواں دھار پگڑ لپیٹ لیتا لاف وگزاف کو حکم دیتا کہ شیخی اور نمود کے ساتھ آگے جا کر غل مچانا شروع کر دو۔"

4۔ حُسنِ الفاظ

آزاد ایک صاحبِ طرز ادیب اور اہلِ زبان ہیں۔وہ الفاظ کا جادو جگاتے ہوئے الفاظ کی تراش خراش اور حسن ورعنائی پر اسدرجہ زور دیتے ہیں کہ بعض اوقات مفہوم کو نظر انداز کر جاتے ہیں۔ان کے جملے لفظی تصویر اور صوتی آہنگ کے حامل ہوتے ہیں اور یہ وہ صفت ہے کہ قاری مسحور ہو کر رہ جاتا ہے۔مثلاً ہماری نصابی کتاب کے ایک مضمون **سچ اور جھوٹ کا رزم نامہ** سے ایک اقتباس پیشِ خدمت ہے:

" آگے آگے فتح واقبال نور کا غبار اُڑاتے آتے تھے اور پیچھے پیچھے اِدراک پر پہ تھا مگر صاف معلوم ہوتا تھا کہ تابع ہے شریک نہیں۔ملکہ کی شان شاہانہ تھی اور دبدبہ خسروانہ تھا۔اگرچہ آہستہ آہستہ آتی تھی مگر استقبال رکاب پکڑے تھا، جو قدم اٹھتا تھا، دس قدم آگے پڑتا نظر آتا تھا۔"

5۔ صاحبِ طرز ادیب

مولانا آزاد ایک صاحبِ طرز انشاء پرداز ہیں اور ان کا یہ طرزِ نگارش اپنی مثال آپ ہے یہی وجہ ہے کہ کوئی بھی شخص ان کے اس اسلوب کی تقلید نہ کر سکا جس کی وجہ سے وہ ایک منفرد مقام پر تنہا فائز ہیں لیکن یہی منفرد انداز تحریر عیب بھی بن گیا کیونکہ جہاں تک خیالی وتصوراتی مضامین کا تعلق ہے یہ انداز نبھ جاتا ہے مگر تاریخی حقائق پر قلم اٹھاتے ہوئے وہ انشاء پردازی میں اسقدر محو ہو جاتے ہیں کہ حقائق واقعات فراموش ہو جاتے ہیں اس وقت مورخ ہونے کے بجائے محض ایک افسانہ نگار ہو کر رہ جاتے ہیں مثال کے طور پر **آبِ حیات** میں میر تقی میرؔ کا قصہ پڑھ کر لوگ آزاد کی طرزِ تحریر کے سحر میں اس طرح کھو گئے کہ کسی کو یہ خیال تک نہ آیا کہ کیا واقعہ میرؔ نے لکھنو میں " کیا بود و باش پوچھو ہو پورب کے ساکنو" قطعہ پڑھا بھی تھا یا نہیں۔

6۔ تاریخ نگاری

مولانا محمد حسین آزاد ایک صاحبِ طرز انشاء پرداز مضمون نگار، ادیب، شاعر اور نقاد ہونے کے ساتھ ساتھ ایک تاریخ داں اور مورخ بھی ہیں اور اس میدان میں بھی ان کا اپنا ایک مقام ہے۔**دربارِ اکبری** میں آزاد نے مسلمانوں کی تہذیب ومعاشرت کی بھرپور عکاسی کرتے ہوئے بے مثال جزئیات نگاری کی ہے مگر صرف ایک خامی ہے کہ تحقیق کا عنصر تشنہ ہے اور یہی کیفیت دیگر تذکروں کی ہے کہ ان کا نقطۂ نظر ایک مورخ کا نہیں بلکہ وہ ہر بات انشاء کے نظریہ سے لکھتے ہیں اور تاریخی حقائق کو چھوڑ کر تمام تر توجہ انشاء پردازی پر ہوتی ہے نتیجہ کے طور پر تاریخ نویسی ادبیت کا شکار ہو کر رہ جاتی ہے۔

7۔ مُرقع نگاری

آزاد ماضی کے واقعات کی تصویر کشی بڑی مہارت اور ہنرمندی سے کرتے ہیں۔مرقع نگاری، جزئیات نگاری، کردار نگاری اور سراپا کشی کو کہتے ہیں جس میں کسی شخص یا چیز کی مکمل تصویر ہوتی ہے۔گذری ہوئی ادبی محفلوں، تاریخی داستانوں کی منظر کشی کیلئے وہ تخیل، جذبات اور حسن وزورِ بیان سے کام لیکر ایک ماحول یا نگار خانہ تیار کر دیتے ہیں جس کی ہنستی بولتی اور جیتی جاگتی تصویریں قاری کو ایک رنگین ومتحرک موثر فلم کی طرح متاثر کرتی ہیں۔۔۔" آبِ حیات، دربارِ اکبری، قصص ہند اور نیرنگِ خیال" اس کی عمدہ مثالیں ہیں۔ خصوصاً **آبِ حیات** میں اس مشاعرے کی مرقع کشی بے مثال ولافانی ہے جس میں وہ درج ذیل مطلع والی غزل پڑھتے ہیں:

کمر باندھے ہوئے چلنے کو یاں سب تیار بیٹھے ہیں
بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں

8۔ ایجاز واختصار

ایجاز واختصار کا مطلب ہے، مختصر الفاظ اور فقروں میں بڑی سے بڑی بات کہنا۔وہ طویل طویل فقرے لکھنے سے گریز کرتے ہیں اور ایجاز واختصار سے کام لیتے ہوئے بڑی سے بڑی بات چند لفظوں اور چند فقروں میں کہہ ڈالتے ہیں۔ازاد فطرتاً داستان گو اور داستان طرز ادیب ہیں۔اس کا اندازہ آبِ حیات اور دربارِ اکبری نیز قصصِ

ہندکی تحریر و حکایات سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔

9۔ شگفتہ نگار ادیب

آزاد کی شگفتہ نگاری کا سحر آبِ حیات میں پورے عروج پر ہے۔ تاریخِ ادب اردو کی رخشندہ کتاب اپنے اندازِ تحریر سے افسانہ نگاری کا لطف دیتی ہے اس کتاب میں وہ مرزا محمد رفیع سوداؔ کے متعلق لکھتے ہیں کہ "ان میں ایک شخص دیکھا کہ جب وہ بات کرتا تھا تو اس کے منہ سے رنگا رنگ کے پھول جھڑتے تھے لوگ ساتھ ساتھ دامن پھیلاتے تھے مگر بعض پھولوں میں کانٹے ایسے ہوتے تھے کہ لوگوں کے کپڑے پھٹتے چلے جاتے تھے۔" یہ آزاد کی شگفتہ نگاری کا کمال ہے کہ بڑے بڑے ان کے لطیفوں اور چٹکلوں کے چکر میں ایسے آئے ہیں کہ یہ طے نہیں کر سکتے کہ یہ چٹکلے واقعات ہیں یا افسانہ اور صرف زیب داستاں کے لیے آزاد نے ان سے کام لیا ہے۔

10۔ تمثیل نگاری

مولانا محمد حسین آزاد کی تحریر کی ایک خوبی تمثیل نگاری اور مکالمہ نویسی بھی ہے۔ نیرنگ خیال میں ان کی یہ خصوصیت اپنی پوری شان اور آب و تاب کے ساتھ جلوہ فرما ہے۔ اپنی تحریروں میں وہ کسی حالت یا چیز کو ذی روح شخص قرار دیکر اس کی صفات و حرکات کو اس طرح پیش کرتے ہیں کہ بے جان چیزیں مجسم ہو کر زندہ لوگوں کی طرح باتیں کرتی ہیں۔ مثلاً آزاد دربارِ اکبری میں لکھتے ہیں کہ "غفلت نے جب آنکھ کھولی اور ہمت نے اپنے قدم پیچھے ہٹا لیے تو حوصلہ مندی نے جائے لی"۔ یہ آزاد کا اندازِ تمثیلی ہے جسمیں افسانے کی لطافت اور غزل کی رعنائی ہے۔ یہ وہ ڈرامائی کیفیت ہے جو قاری کے دل و دماغ میں دلچسپی کا سبب بن جاتی ہے۔

لِسانی مآخذ

مولانا محمد حسین آزادؔ نے اردو اور فارسی زبان کی اصل اور اس کی عہد بعہد ترقیاتی مدارج اور طویل تاریخ پر بڑے سائنٹیفک انداز میں روشنی ڈالی ہے۔

رجب علی بیگ سرور

تعارف و مختصر تفصیل

رجب علی بیگ سرور ۱۷۸۶ء میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے لکھنؤ ہی میں آپ کی تعلیم و تربیت ہوئی اور عربی و فارسی کی تعلیم بھی آپ نے لکھنؤ ہی میں حاصل کی۔ خطاطی و موسیقی سے بھی لگاؤ تھا۔ شاعر بھی تھے شاعروں میں آغا نوازش علی سے اصلاح لیتے تھے۔ نواب غازی الدین حیدر کی نوابی کا زمانہ تھا انہوں نے کسی بات پر ناراض ہو کر ان کو جلاوطن کر دیا۔ سرور کانپور چلے گئے وہاں وہ سخت پریشان رہے کسی طرح بھی چین نہ تھا اور برابر لکھنؤ آنے کے لئے کوشاں رہے بالآخر نواب واجد علی شان کے زمانے میں واپس لکھنؤ آئے اور شعرائے دربار میں شامل ہوئے۔ انہوں نے حکمِ شاہی سے کتاب ''شمشیر خانی'' کا ترجمہ کیا جس کا نام سرور سلطانی رکھا گیا۔

جنگِ آزادی کے بعد سرور بنارس چلے گئے اور وہاں انہوں نے قیام کے دوران دو بہترین کتابیں گلزار سرور اور شبستان سرور لکھیں جو ان کی انشاء پردازی کے اچھے نمونے ہیں انہوں نے ایک کتاب فسانہ عبرت بھی لکھی جس میں لکھنؤ کی بادشاہت کے آخری ایام اور انتزاع سلطنت کا حال لکھا ہے۔ سرور کا سب سے بڑا کارنامہ ادبی ''فسانۂ عجائب'' ہے فسانہ عجائب کو اُردو ادب میں ایک شاہکار کا درجہ حاصل ہے اور یہی وہ ادبی کارنامہ ہے جس نے رجب علی بیگ سرور کو شہرت لازوال عطا کی اور انہیں اُردو ادب میں ایک بلند مقام عطا کیا۔

آپ نے ۱۸۶۷ء میں وفات پائی۔

رجب علی بیگ سرور کا طرزِ تحریر اچند اہم خصوصیات

۱۔ دلچسپ اندازِ بیان

رجب علی بیگ سرور کا اندازِ بیاں نہایت دلچسپ اور پُر لطف ہے فسانۂ عجائب اس کی بہترین مثال ہے رجب علی بیگ سرور کا سب سے عظیم ادبی کارنامہ کا فسانۂ عجائب کی تصنیف کو ہی تصور کیا جاتا ہے اس تصنیف میں انہوں نے دلچسپ انداز تحریر اختیار کیا ہے کہ پڑھنے والا بور نہیں ہوتا بلکہ ایک لطف اُسے حاصل ہوتا ہے۔

۲۔ تشبیہات اور تلمیحات کا استعمال

رجب علی بیگ کی طرزِ تحریر کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ تشبیہات و تلمیحات کا استعمال بڑے مؤثر انداز میں کرتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کی تشبیہات حسین اور تلمیحات رنگین ہیں فسانۂ عجائب میں انہوں نے اس کا استعمال بڑے ہی دلکش انداز میں کیا ہے۔

۳۔ انشاء پردازی

فسانۂ عجائب ویسے تو ایک عام سا فسانہ ہے اور اسکی بنیاد دیو اور پریوں اور جادو کے قصوں پر رکھی گئی ہے لیکن سرور کی یہ خوبی ہے کہ انہوں نے اپنی انشاء پردازی اور عمدہ طرزِ تحریر سے اس میں ایک نئی روح پھونک دی ہے اور فسانہ کو اتنا دلچسپ اور دلکش بنا دیا ہے کہ پڑھنے والے کو کسی قسم کی اکتاہٹ نہیں ہوتی بلکہ اس کی دلچسپی شروع سے آخر تک برقرار رہتی ہے حالانکہ اس کی زبان مسجع و مقفیٰ ہے لیکن اس کے باوجود اس دور میں بھی اسے پسند کیا جاتا ہے۔

۴۔ انفرادی شان

فسانۂ عجائب میں سرور کی طرزِ تحریر نے ایک انفرادی مقام پیدا کیا ہے وہ اس طرح کہ ایک طرف تو فسانۂ عجائب میں پریوں کے قصے، جنوں کے قصے اور جادو کے کرتب موجود ہیں تو دوسری طرف اس کے بعض حصوں میں لکھنؤ کی معاشرتی زندگی کا تہذیبی رچاؤ موجود ہے جس کی وجہ سے اس میں انفرادی شان پیدا ہوگئی ہے فسانۂ عجائب میں جو کردار پیش کئے گئے ہیں وہ جیتے جاگتے معلوم ہوتے ہیں اور وہ فقرہ بازی، حاضر جوابی اور نوک جھونک میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔

۵۔ شوخی و شگفتگی و رنگینی

سرور کی طرزِ تحریر کی ایک اور بڑی خصوصیت شوخی و شگفتگی و رنگینی ہے یعنی ان کی نثریں بڑی رنگین ہوتی ہے اور شوخی و شگفتگی کی وجہ سے اس میں بڑا مزا آتا ہے اس لحاظ سے ہم ان کو نثر کو شاعرانہ نثر کہہ سکتے ہیں۔

۶۔ خصوصیات

مسرور کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ ان کا مشاہدہ بہت گہرا اور علم بہت وسیع ہے واقعات کے بیان میں وہ جزئیات کو اس طرح پیش کرتے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے اور پڑھنے والا بے لطف نہیں ہوتا بلکہ اس کی دلچسپی برقرار رہتی ہے۔

مختصر یہ کہ

ان ہی تمام خصوصیات کے باعث رجب علی بیگ سرور اُردو ادب میں ایک منفرد مقام رکھتے ہیں ان کا طرزِ تحریر دلکش، مؤثر اور پُر لطف ہے ان کی نثر میں شوخی بھی ہے شگفتگی بھی، رنگینی بھی ہے اور انشاء پردازی بھی۔ سرور تشبیہات و تلمیحات کا استعمال بڑے عمدہ انداز میں کرتے ہیں۔ آپ کا اندازِ بیان اس قدر دلچسپ ہے کہ پڑھنے والے کو اکتاہٹ نہیں ہوتی بلکہ اسے لطف آتا ہے اور شروع سے آخر تک اس کی دلچسپی برقرار رہتی ہے۔

۷۔ قافیہ آرائی سرور کی تحریر کی ایک اور خصوصیت ہے

قافیہ آرائی رجب علی بیگ سرور کا خاص میدان ہے ان کی طرزِ تحریر میں بہت سے مقامات پر مقفیٰ جملے ملتے ہیں ان کا اندازِ تحریر رعایت، لفظی، تکلف اور تصنع سے مرکب ہے جس میں پیچیدگیاں میں الجھاوے ہیں، رکاوٹیں ہیں، آزمائشیں ہیں اس کے باجود اس میں ایک قسم کی دلچسپی و جاذبیت ہے۔

۸۔ تصویر کشی

رجب علی بیگ سرور کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ اپنے قلم سے پیشِ نظر ماحول کی ایسی تصویر کشی کرتے ہیں کہ ہر شے جیتی جاگتی دکھائی دیتی ہے یوں سمجھ لیں کہ سرور کی تحریر کے پس منظر میں لکھنؤ کی تہذیب اپنی پوری رعنائیوں کے ساتھ جلوی فگن نظر آتی ہے۔

حرفِ آخر

بحث کو مختصر اور ختم کرتے ہوئے آخر میں یہ بات بجا طور پر کہی جاسکتی ہے کہ رجب علی بیگ سرور کی ادبی خدمات ناقابلِ فراموش ہیں ان کی طرزِ تحریر اور ادبی خدمات نے انہیں اُردو ادب کا ایک بہت منفرد اور عظیم نثر نگار بنا دیا ہے۔ سرور کا طرزِ ادا ایسا ہے کہ یوں معلوم ہوتا ہے کہ وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے اپنی داستان کو سب سے پہلے براہِ راست عوام تک پہنچایا ہے۔

رجب علی بیگ سرور کی نثر کو لکھنؤیت کی علامت سمجھا جاتا ہے سرور نہ فسانۂ عجائب کے علاوہ فسانۂ عبرت، گلزارِ سرور شبستانِ سرور، انشائے سرور وغیرہ بھی تحریر کیں۔ ان

M.HARIS BASIM

تمام تصانیف میں رجب علی بیگ نے اپنے منفرد انداز اور انفرادی شان کو برقرار رکھا ہے پس تمام خصوصیات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ رجب علی بیگ سرور اُردو نثر کی تاریخ میں ایک منفرد اور بلند مقام رکھتے ہیں اُن کا نثری سرمایہ اُردو ادب کی جان ہے انہوں نے جو کچھ لکھا خوب لکھا اور اپنے زورِ بیان سے اس میں نئی روح پھونک دی۔

مختصر یہ کہ آپ کا نام و مقام اُردو ادب کی تاریخ میں ہمیشہ زندہ رہے گا۔

الطاف حسین حالؔی

(پیدائش 1837ء ؛ وفات 1914ء)

سوانح حیات

مولانا حالی پانی پت میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم بھی وہیں حاصل کی۔ پھر مزید تعلیم حاصل کرنے کے لیے دہلی چلے گے۔ یہاں شیفتہ اور غالب کسبِ فیض کی سعادت حاصل ہوئی۔ جنگِ آزادی کے بعد وہ لاہور چلے گئے اور پنجاب گورنمنٹ بکڈپو میں انگریزی سے اردو ترجمہ ہونے والی کتابوں کی زبان کی درستگی پر مامور ہو گئے۔ ان کتابوں کے مطالعہ سے حالی کو مغربی افکار و خیالات سے شناسائی ہوئی اور ان کی نظر میں وسعت پیدا ہوئی۔ سرسید سے ملاقات کے بعد حالی ان کے مشن (مقصد) کے سب سے بڑے مبلغ بن گئے۔ انہوں نے اپنی شاعری اور نثر نگاری کو سرسید کی تحریک کے لیے وقف کر دیا۔ اپنی شاعری کو اصلاحی رنگ دینے کے لیے جب حالی نے اپنا دیوان شائع کیا تو اس کے لیے ایک مقدمہ لکھا اور یہی مقدمہ شعر و شاعری جدید اردو تنقید کی بائبل بن گیا اور ایک اہم اور مستقل تصنیف بن گیا۔ یہیں سے انہوں نے اپنی قومی شاعری کا آغاز کیا۔ 1914ء میں لاہور میں ہی انتقال ہوا۔

حالی بحیثیت نثر نگار

حالی جہاں ایک نظم گو اور غزل گو شاعر تھے وہیں ایک بہترین نثر نگار بھی تھے۔ انہوں نے جسطرح شاعری میں نت نئے اور پیارے انداز دکھائے ہیں اُسی طرح نثر نگاری میں بھی بڑے اعلیٰ ترین جوہر دکھائے ہیں۔ حالی کی شخصیت اور طرزِ تحریر میں بڑی مطابقت پائی جاتی ہے۔ ان کی نثر میں آہنگ کی اک عجیب شان پائی جاتی ہے۔ ان کی نثر میں عبارتوں کا آہنگ ان کی دلیلوں کے تابع ہوتا ہے۔ وہ فقروں کو اس طرح مرتب کرتے ہیں کہ خیال پیچھے رہ جاتا ہے اور عقل آگے بڑھ جاتی ہے اور قاری بڑے سکون سے وہ بات سمجھ لیتا ہے جو پیش کی جا رہی ہے۔

حالی کا مرتبہ و حیثیت شاعر، سوانح نگار، نقاد اور بہ حیثیت نثر نگار ہر حیثیت میں بڑا بلند ہے۔ ان کی نثری تصنیفات میں حیاتِ سعدی، حیاتِ جاوید اور یادگارِ غالب بہت مشہور ہیں۔ حالی کی اس قدر کاوشوں کی بدولت ہم انہیں ایک مسلمہ ادیب کی حیثیت سے تسلیم کرتے ہیں۔

حالی کی نثر کی خصوصیات (اسلوبِ تحریر) درج ذیل ہیں؛

1۔ سادگی بیان

حالی دبستانِ سرسید کے دبستان نثر کے ایک ممتاز کارکن تھے۔ اسی لیے دبستان نثرِ سرسید کی ایک خوبی سادگی بیان بھی ہے جو حالی کی نثر کی بھی ایک خوبی ہے۔ حالی کی سادگی بیان کو سرسید کی طرزِ انشاء کی جمیل تر اور ترقی یافتہ شکل کہا جا سکتا ہے لیکن حالی کی نثر سادہ ہونے کے باوجود بھی علمی سطح کی سادگی کی حامل ہے۔ حالی کی تحریریں میں عوامی سطح پر نہیں آتیں لیکن ان میں ادبیت کا حُسنِ بایں ہمہ سادگی موجود ہوتا ہے۔ مطالب کو سادہ طریق سے سادہ الفاظ میں تجزیے کے ساتھ پیش کرنا حالی کا ہی کارنامہ ہے۔

2۔ بے ساختگی

اگر سرسید اور شبلی نے بھی اپنے اندازِ بیاں میں بے ساختگی کو اپنایا مگر دبستانِ سرسید کے تمام ادیبوں میں صرف حالی کی تحریریں ایسی ہیں جن میں بے ساختگی ادبی لطافت کے ساتھ موجود ہے۔ حالی جس طرح کے مضامین لکھتے ان میں وسعت اور ہمہ گیری ہوتی۔ سرسید کی طرح حالی نے بھی انگریزی الفاظوں کا استعمال کیا لیکن حالی کا امتیاز یہ ہے کہ انہوں نے انگریزی الفاظوں کا استعمال بے ساختگی کمال کے ساتھ کیا۔ ان کی نثر میں وہ بے تکلفی اور بے ساختگی ہے جسے قرینِ فطرت بھی کہا جا سکتا

M.HARIS BASIM

ہے۔

3۔ مُدّعا نگاری

مُدّعا نگاری یعنی مقصد نگاری کا مطلب یہ ہے کہ آرائشِ بیان کی بجائے مطلب نگاری کو اولیت دی جائے۔ حالی اپنی تحریروں میں لمبی چوڑی تمہیدیں نہیں باندھتے اور نہ ہی آرائشِ بیان و تکلف کے پیرہن میں اپنی نثر کو ملبوس کرتے ہیں بلکہ اپنے مقصد و مدعا کو بذریعہ نثر قاری تک بڑے سادہ اور سہل انداز میں پہنچاتے ہیں۔ مُدّعا نگاری کی اس روش نے اگرچہ ان کے اسلوب پر سادگی و سلاست کی پرچھائیں گہری کر دی اور اس کا بڑا فائدہ یہ ہوا کہ حالی اردو نثر کو سکہ بند اور ٹکسالی کر گئے۔

4۔ منطقیت اور استدلالیت

منطق اندازِ بیان بھی حالی کے یہاں ایک سُلجھی ہوئی اور دل نشین کیفیت لیے ہوئے ہے اور اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ حالی مزاج کے اعتبار سے ایک ادیب اور شاعر کا دل و دماغ لے کر آئے ہیں۔ چنانچہ جب وہ بحث میں کسی دعوے کا ثبوت بہم پہنچاتے ہیں تو قیاسِ تمثیلی سے کام لیتے ہیں۔ وہ اپنے بیان کو زیادہ موثر بنانے کی کوشش کرتے ہیں خواہ وہ منطقی طور پر عقل کو اطمینان دے سکے یا تخیلاتی طور پر۔

5۔ تشبیہات و استعارات

حالی کی نثری تحریروں میں شاعرانہ طریقہ موجود ملتا ہے۔ وہ اپنی شاعرانہ جبلت اور ادبی مزاج سے مجبور ہو کر شاعروں کی طرح تشبیہات و استعارات پر اتر آتے ہیں اور بات عقلی سے زیادہ شاعرانہ بن جاتی ہے۔ حالی اپنی تشبیہ اور تمثیل سے بات کو پھیلا کر واضح کرنے کا ڈھنگ اختیار کرتے ہیں جس سے تفصیل کو اچھال کا رنگ ملتا ہے۔ حالی صنائع و بدائع کو کلام کا زیور نہیں سمجھتے لیکن بعض موقعوں پر تشبیہات و استعارات سے کام لینا اچھی طرح جانتے ہیں۔

6۔ دھیما پن، سکون اور اعتدال

نثرِ حالی کا ایک وصف دھیما پن، سکون اور اعتدال بھی ہے۔ حالی جس طرح خود بڑے نفیس حلیم الطبع، شریف النفس اور منکسر المزاج انسان تھے ایسی ہی خصوصیات ان کی نثر میں بھی پائی جاتی ہیں۔ سنجیدگی و متانت جو ان کی شخصیت کا جزو تھے وہی دھیما پن سکون اور اعتدال ان کی تحریروں سے نمایاں ہے۔ بقول رام بابو سکسینہ؛ "حالی کے ہاں آزاد کی سوشوخی اور رنگینی اور نذیر احمد کی سی نازک اور لطیف ظرافت نہیں لیکن زور بیاں اور فصاحت سے ان کی عبارت مالا مال ہوتی ہے۔"

مختصراً یہ کہ حالی کا شمار اردو ادب کی ان چند مخصوص اور برگزیدہ ہستیوں میں ہوتا ہے جنہوں نے اپنی پوری زندگی تصنیف اور تالیف میں گزاری اور ساری زندگی عملی مشاغل اور زبان و ادب کے لیے وقف کر دی۔ حالی صاحبِ طرز انشاء پرداز تو نہیں انہوں نے اردو ادب کو کسی نئے اُفقِ تحریر سے روشناس نہیں کرایا لیکن اُس کے باوجود تاریخِ اردو ادب میں ان کا مقام بڑا بلند ہے اور اردو ادب میں تنقید کا شعور خصوصاً حالی کا ہی کارنامہ ہے۔ وہ اردو کے پہلے سوانح نگار اور تنقید نگار ہیں۔

ڈاکٹر سید عبداللہ کہتے ہیں کہ مولانا حالی نثر ہی میں نثر لکھتے تھے۔ شبلی، آزاد سے بھی شاعری کا کام لینا چاہتے تھے۔ اس معاملہ خاص میں حالی، شبلی اور آزاد سے یقیناً بہترین نثر نگار تھے۔ بالکل اس طرح جیسے

افسانہ تیرا رنگین رُوداد تیری دلکش
شعر و سُخن کو تو نے جادو بنائے چھوڑا

مولانا شبلی نعمانی

تعارفِ مصنف

۱۸۸۲ء کا سال شبلی کی زندگی میں نہایت اہم سال تھا۔ اس سال شبلی اپنے بھائی مہدی کو ملنے علی گڑھ گئے۔ جہاں سرسید سے ملاقات ہوئی اور وہیں کے ہو رہے۔ سرسید کی لائبریری اور علی گڑھ کے پروفیسر آرنلڈ کی صحبتوں نے شبلی کی ذہنی و فکری صلاحیتوں میں قدیم و جدید علوم سے ایک ساتھ استفادہ کی راہ ہموار کر دی۔ اس طرح شبلی کا فداق جدید طرز تنقیدی و تحقیق سے ہم آہنگ ہوا۔ ۱۸۹۲ء میں آرنلڈ کے ہمراہ سفر بلادِ اسلام (روم، مصر، شام) پر روانہ ہوئے۔ سرسید کے انتقال کے بعد چار سال حیدر آباد کے دائرۃ المعارف میں کام کرتے رہے۔ نئی نسل پر شبلی کا اثر اپنے ہمعصروں میں سے سے زیادہ ہوا ہے۔ شبلی نے ہندوستان کے مسلمانوں کی ذہنی زندگی

پر اثر ڈالا اور انہیں اپنی چیزوں کی قدر کرنی سکھائی۔ انہیں ہندوستان سے باہر دوسرے اسلامی ممالک کے مسائل کو محسوس کرنے کا عادی بنایا۔ ان میں حقوق کی طلب اور خوشامدانہ سیاست سے بلندی پیدا کی۔

شبلی اُردو کے عناصرِ خمسہ میں بلحاظ عمر سب سے چھوٹے تھے۔ وہ ایک ہنگامہ میں پیدا ہوئے اور دوسرے میں مرے (پیدائش ۱۸۵۷ء ، وفات ۱۹۱۴ء)۔ وہ تصنیف و تالیف کے میدان میں سب سے بعد میں اُترے لیکن کسی سے پیچھے نہ رہے۔ شبلی کا مطالعہ بے انتہا وسیع تھا۔ وہ مسلمانوں کے گزشتہ کارناموں پر تفصیل سے لکھنا چاہتے تھے، اس سلسلے میں انہوں نے ایک تجویز مرتب کی تھی جسے تکمیل تک پہنچانا حقیقتاً فردِ واحد کا کام نہیں بلکہ جماعت کا کام تھا لیکن شبلی نے اس میں سے کافی بڑے اور اہم حصے کی تکمیل خود پر ڈالی۔

تصانیفِ شبلی

1۔ سیر و سوانح:۔ المامون، الفاروق، سیرۃ النعمان، سیرت النبی ﷺ۔
2۔ فلسفہ کلام:۔ علم الکلام، الغزالی، سوانح مولانا روم، الکلام تنقید
3۔ ادبیات:۔ موازنہ انیس و دبیر، شعر العجم
4۔ تعلیمات:۔ مسلمانوں کی گزشتہ تعلیم۔
5۔ سفرنامہ:۔ سفرنامہ مصر و روم و شام
6۔ تاریخ:۔ تاریخِ اسلام، مضامین متعلق عالمگیر، سلسلہ شاہیرِ اسلام
7۔ خطوط:۔ مکاتیبِ شبلی ۳ حصے۔

شبلی کی نثر نگاری کی خصوصیات

سرسید کے ہم عصروں میں شبلی ایسے انشاء پرداز ہیں جن کا اسلوبِ نگارش اگر ایک طرف اپنے دائرہ عمل میں زندگی ہی کی طرح لامحدود ہے تو دوسری طرف اس میں ادبیت کی شان بھی بدستور قائم ہے۔ شبلی الفاظ و تراکیب کی تراش خراش میں آزاد کی طرح نہیں الجھتے کہ ان کا اسلوب ہمیں محدود نظر آنے لگے۔ مولانا شبلی نہ صرف اعلیٰ درجے کے نثر نگار تھے بلکہ بلند پایہ محقق اور مورخ بھی تھے جن کی نثر نگاری میں مندرجہ ذیل خوبیاں نمایاں ہیں؛

1۔ جوشِ بیان

اسی طرح اسلوب کی طرف سے وہ بے نیازی جو سرسید کے یہاں نظر آتی ہے وہ شبلی کے ہاں نہیں پائی جاتی۔ مولانا حالی کی تحریروں میں جذبات کی جس شدت اور جس ذاتی اور شخصی رنگ کا فقدان نظر آتا ہے وہ شبلی کے ہاں آکر بہت حسین و جمیل انداز میں اپنے آپ کو ظاہر کرتا ہے ان خصوصیات نے مل کر شبلی کے طرزِ تحریر کو اُردو کیلئے باعث صد نازش بنا دیا۔ شبلی نے مختلف موضوعات، تاریخ، تذکرہ، سوانح، تنقید، سیاسیات، ادب، معاشرت، حدیث، فقہ، عقائد اور تصوف، تمام پر قلم اُٹھایا۔ مگر ان تمام موضوعات کے لیے ایک ایسا پیرایہ بیان اختیار کیا جو کہیں غیر موزوں معلوم نہیں ہوتا۔ اس لیے شبلی کی تنقید نگاری، تاریخ نگاری، شاعری یا دوسری تمام ادبی کاوشوں سے قطع نظر ان کا سب سے بڑا کارنامہ فن ان کے اسلوبِ بیان ہی کو قرار دیا جاسکتا ہے جو ان کی عظمت کے آثار کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے قائم رکھے گا۔ شبلی نے حسن کاری کو اپنے یہاں بہت اہمیت دی ہے۔ لیکن جو چیز انہیں قدیم فارسی نثر نگاروں یا آزاد اور سرور سے ممتاز کرتی ہے وہ یہ ہے کہ اُنہوں نے مقصدیت کو بھی ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ یہ توازن بھی انکی انفرادیت کا حصہ ہے جس کی طرف خورشید الاسلام نے ان الفاظ میں اشارہ کیا ہے کہ شبلی حسنِ خیال کے بھی قائل تھے اور حسنِ عمل کے بھی۔ ان کی زندگی توازن میں صرف ہوئی۔ شبلی پہلے یونانی ہیں جو مسلمانوں میں پیدا ہوئے وہ انشاء پرداز تھے اگر انشاء پرداز نہ ہوتے تو مصور ہوتے۔ ان کے مزاج میں رومانیت تھی۔ ان کا مزاج شاہانہ تھا جس میں رنگینی و رعنائی اور حُسن و زیبائی کے لیے بے پناہ گنجائش تھیں۔ رنگین مزاج اور وسعت مطالعہ ان کی شخصیت کے اوصافِ خصوصی تھے۔

2۔ ایجاز و اختصار

شبلی کے اسلوبِ بیان کی دوسری بڑی خوبی ایجاز و اختصار ہے۔ وہ بعض اوقات ایک صفحے کا کام ایک سطر سے لیتے ہیں، پُر لطف مقام وہ ہوتا ہے جب وہ موقع کی موازونیت سے فائدہ اُٹھا کر ایک شعر سے کئی صفحوں کا کام لیتے ہیں۔ ان کے بیان میں جو لطف اور جوش ہے اس کا بڑا وسیلہ یہی اختصار و ایجاز ہے۔ کلام میں یہ کیفیت

پیدا کرنے کیلئے وہ کئی طریقے اور کئی صورتیں اختیار کرتے ہیں جن میں سب سے محبوب و مرغوب مبالغہ ہے۔ ان کے مبالغوں میں شدت جوش، اچانک پن اور ایک کڑک کی سی ناگہانی کیفیت ہوتی ہے۔ اختصار و ایجاز کے لیے وہ تشبیہات سے بالعموم اور استعارات سے بالخصوص کام لے کر اپنی عبارت میں ادبی شان پیدا کر دیتے ہیں۔ عدیم الفرصتی اور کثیر المشاغلی انہیں اختصار پر مجبور کرتی ہے اور پھر وہ تشبیہوں اور استعاروں سے مبالغ کی انتہا کر دیتے ہیں۔ "حسن کی عالمگیری نے تمام ملک میں عشق کی آگ لگادی اور ذرہ ذرہ عشق سے مشتعل ہوگیا۔" اس فقرے میں مبالغہ لاکھ سہی مگر زائد لفظ کوئی نہیں۔ اس کا نام تو منشور شاعری ہے۔ بقول ڈاکٹر سید عبد اللہ؛ "وہ نثر نگار تو محض اپنے ماحول کی وجہ سے ہونے پر مجبور ہوئے ورنہ ان کی فطرت کی بیشتر خصوصیات وہ ہیں جو کسی میر تقی میر، کسی فغانی یا کسی غالب کی ہوسکتی ہے"۔

3۔ شاعرانہ انداز

شبلی کی نثر کا ایک خاص امتیاز اس کی شعریت ہے۔ ایک خاص رنگ کے شاعرانہ عناصر مولانا آزاد کی نثر میں بھی ہیں۔ مگر نثر شبلی کی شعریت کی خاص بات یہ ہے کہ اس میں وہ عناصر زیادہ ہیں جو غزل سے مخصوص ہیں ان ترکیبوں میں شباب و شراب، بہار و موسم، گل ہستی و بے خودی، رنگینی و رعنائی کے تصورات پائے جاتے ہیں۔ لطیف، خوش آواز شیریں، سبک، جزبہ انگریز اور حسین الفاظ اور بے خود کر دینے والی ترکیبیں سب شاعری کی دنیا سے حاصل کرتے ہیں اور نثر میں بڑی سلیقہ مندی اور خوش مزاجی سے کھپا دیتے ہیں۔ استعارہ، کنایہ اور خوبصورت تراکیب کے علاوہ فارسی کے برمحل اشعار لاکر بڑے وسیع معانی اور علمی مطالب کو رنگین، مختصر اور دلکش انداز میں ادا کر دیتے ہیں۔

4۔ موسیقیت

شبلی کی نثر بظاہر سادہ ہوتی ہے مگر اس میں حسن کاری کی ایک خاص شان پائی جاتی ہے جو ان کے شاعرانہ بیان کے ساتھ ان کی نثر کو صوتی اور ظاہری اعتبار سے بھی اثر حسن اور لطف کا نادر مجموعہ بنا دیتی ہے مگر یہ صنعت گری آزاد کی صنعت گری سے مختلف ہے کیونکہ تکلف کے مقابلے میں بے ساختہ پن ہے۔ یہاں مدعا اور مضمون کے اقتفاء سے خود بخود ایک خاص قسم کی صوتی فضا پیدا ہوگئی ہے۔ مثلاً جوش انگیز خیالات کے اظہار کے وقت شبلی کی تحریروں میں خود بخود ایک خاص قسم کی موسیقی پیدا ہو جاتی ہے جو ساری عبارت کے مدوجزر میں خوشگوار لے کو ابھارتی ہے۔ یہ چیز الفاظ اور حروف کی تکرار سے حاصل ہوتی ہے۔ وہ اس انداز سے کہ ہر جگہ کامل بے ساختگی کا اظہار ہوتا ہے۔ شبلی کے طرزِ تحریر کے متعلق جامد حسن قادری کہتے ہیں کہ "شبلی اپنے زمانے کے پہلے شخص ہیں جنہوں نے اسلوبِ تحریر کی اہمیت کو سمجھا۔"

5۔ بے ساختگی و برجستگی

شبلی کے اسلوبِ بیان کا ایک وصف بے ساختگی بھی ہے مگر یہ بے ساختگی سرسید اور حالی کی تحریروں کی بے ساختگی سے مختلف ہے۔ شبلی کے طرزِ تحریر کے متعلق سرسید "دیباچہ المامون" میں لکھتے ہیں کہ "ایسی صاف و شستہ اور برجستہ عبارت ہے کہ دِلّی والوں کو بی اس پر رشک آتا ہوگا۔" شبلی کی نثر بھی بے ساختہ ہوتی ہے مگر نہایت چست، مدعا نگاری وہ بھی کرتے ہیں مگر کہنے کا انداز پر تکلف ہوتا ہے۔ غالباً اُردو کا کوئی اور انشاء پرداز ایسا نہ ہوگا جس کی عبارت میں موضوع اور بیان میں ایسا خوبصورت پیوند قائم ہوتا ہو۔ ہر بات بے ساختہ کہے چلے جاتے ہیں۔ شاید ایک لفظ بھی کہیں بے ضرورت معلوم نہیں ہوتا۔ حالی کی تمثیلیں اور مرکب تشبیہیں بعض اوقات ان کے تکلف اور بے جا اہتمام کا پتہ دیتی ہیں مگر شبلی کی تحریروں میں بے جا اہتمام شاید تلاش کرنے سے بھی نہ ملے گا اور وہ طریقہ یہ ہے کہ ان میں کمال بے ساختگی کے باوجود تحمل کا ایک خاص انداز اور حسن کی ایک خاص شان پائی جاتی ہے۔

6۔ شبلی کا انداز ادیبانہ یا مورخانہ

مہدی آفادی لکھتے ہیں "شبلی تاریخ کے معلم اوّل ہیں۔ جو کچھ لکھتے ہیں آشنائے فن ہو کر لکھتے ہیں۔ شوخی کے ساتھ سنجیدگی دور سے زبان کی بلائے لیتی ہیں۔" مورخِ عہدِ ماضی کا بے دردانہ پوسٹ مارٹم کرتا ہے وہ سپاٹ انداز میں عہدِ گزشتہ کے واقعات کی تصویر کشی کرنا اپنا فرض سمجھتا ہے۔ لیکن شبلی ایک ایسے مورخ تھے جو مسلمان مشاہیر کے عاشق و دلدادہ تھے۔ وہ ایک مسلسل تاریخ نگار نہ تھے انکی نظر تاریخ کے چند نمایاں ٹکڑوں اور حصوں پر پڑتی ہے۔ الفاروق میں شبلی نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ تاریخ صرف جنگوں کا نام نہیں بلکہ اصل تاریخ تہذیبِ انسانی کا دوسرا نام ہے۔ شبلی کی مورخانہ عظمت اس وجہ سے ہے کہ اُنہوں نے تاریخِ اسلام کے مطالعہ کے اُصول مرتب کیے اور ان کو ایک نئے فلسفۂ تاریخ کی حیثیت سے دنیا کے سامنے رکھا۔

تنقیدی آراء:

M.HARIS BASIM

(۱) مہدی الافادی کہتے ہیں:

شبلی کا وسیع دائرہ تحقیقات، اہل زبان کی سی فارسی اس میں بھی شاعری کا ملکہ راسخ اور سب سے زیادہ اپنی زبان میں اُن کی لائق رشک انشاء پردازی وہ صفات ہیں جو اعلانیہ انکو انکے ہم عصروں سے ممتاز کرتی ہیں۔

(۲) ڈاکٹر عبادت بریلوی کہتے ہیں:

جدید تنقید کی ابتداء حالی، شبلی اور آزاد کے ہاتھوں پیش کئے ہوئے ان کے تنقیدی خیالات ونظریات سے ہوتی ہے جو حالات کا تقاضہ تھا۔

(۳) ڈاکٹر سید علی شاہ کہتے ہیں:

شبلی کا طرز تحریر بھی آزاد کے شگفتہ اور جاندار اور حالی کے سنجیدہ ومُدلّل اور واضح پیرایۂ بیان کو جھلکاتا ہے۔

(۴) ڈاکٹر عابد حسین کہتے ہیں:

شبلی ایک صاحبِ اسلوب نثر نگار ہیں شبلی نے جو اسلوب اردو کو دیا وہ گوں ناگوں اوصاف کا حامل ہے شبلی نے منطقی فکر کو شاعرانہ تخیل میں سمو کر ایک ایسا دلکش اسلوبِ بیان ایجاد کیا ہے جس نے انکی تحریر کے دائرۂ اثر کو بہت وسیع کر دیا ہے۔

شاعری پر تبصرے

میر تقی میرؔ (شہنشاہِ غزل، خدائے سُخن)

فنِ شعر وسُخن کے آسمانوں پر ہزاروں مہ وانجم طلوع ہوئے اور اپنی اپنی ضیائے فکر ونظر اور تابشِ علم وہنر سے اہلِ نظر کو بصارت وبصیرت کی دولت سے فیضیاب کر کے اُفقِ حیات کی پہنائیوں میں گم ہو گئے۔ لیکن اُردو شاعری کا افلاک ہنوز ایک ایسے خورشید علم وآگہی کا منتظر تھا جس کی تابندگی فکر وفن رگِ حیات شاعری کو دائمی توانائی بخشدے اور مسافر جادۂ سخن کے لیے خضرِ منزل بن جائے۔ چنانچہ صدیوں کے جانگسل انتظار کے بعد شعر وادب کے اُفق پر ایک ایسا آفتاب درخشندہ طلوع ہوا جس کے کمالِ فکر وسخن کی تجلیوں کو دیکھ کر بڑے بڑے دیدہ ور انِ سخن کی نگاہیں خیرہ ہو گئیں اور آج بھی جب اِس کے سرمایہ علم پر نظر جاتی ہے تو ایک خوشگوار حیرت سے دوچار ہوئے بغیر نہیں رہتی۔

میر کی عظمت

اُردو کے جن چند خوش نصیب شعراء کو انکی زندگی میں ہی غیر معمولی براشاعر تسلیم کر لیا گیا تھا ان میں میرؔ کو سب سے اعلیٰ وارفع مقام حاصل ہے۔ کوئی انہیں **شہنشاہِ ریختہ** کہتا ہے تو کوئی **اردو کا سعدی**، کسی نے **خدائے سُخن** کے لقب سے پُکارا تو کسی نے انہیں ان کے اصلی نام **میر تقی میرؔ** سے یاد کیا۔ غزلیہ شاعری میں میر کو جو مقام حاصل ہے وہ کسی دور میں کسی کو نصیب نہ ہو سکا۔ اس کی سب سے بڑی وجہ غالباً ہے یہ ہے کہ ان کی زندگی اور اِن کا مزاج غزل کی سادگی وپُرکاری اور غزل کے مزاج سے پوری طرح ہم آہنگ ہے بلکہ یُوں کہنا زیادہ درست ہے کہ میر کا مزاج غزل کا مزاج اور میر کا لہجہ غزل کا لہجہ ہے۔

میر کی شاعری آئینہ نیرنگی زمانہ ہے

میرؔ کا فن، خارجی حالات اور اُنکی سیرت وشخصیت کے سائے میں پروان چڑھا اِن کا زمانہ بھی پُرآشوب تھا اور ان کی زندگی بھی، انہوں نے خارجی ماحول کی عکاسی اپنے گہرے فنی شعور کے ساتھ کی یعنی انہوں نے حالات وواقعات کا جو اثر قبول کیا اسے اپنی شخصیت کا جزو بنا کر غزل کے پردے میں ظاہر کیا۔ اور اس طرح اپنی زندگی اور زمانے کی بے قراریوں کو لفظوں میں مقید کر کے **جگ بیتی** اور **آپ بیتی** کا فرق مٹا دیا۔

کیا تھا شِعر کو پردہ سخن کا
یہی آخر گو ٹھہرا فن ہمارا

M.HARIS BASIM

مرے تغیر حالات پہ مت جا
انقلابات ہیں زمانے کے

دِل کی ویرانی کا کیا مذکور ہے
نگر سو مرتبہ لوٹا گیا

میر کی شاعری کی خصوصیات

ڈاکٹر عبادت بریلوی نے درست کہا ہے کہ غم اور درد کے مضامین ہر شاعر کے یہاں ہوتے ہیں لیکن میر کا کمالِ فن یہ ہے کہ انہوں نے غم کے مضامین باندھے ہیں بلکہ غم ہی کو غزل کے سانچے میں ڈھال دیا۔ اگر ان کا فنی شعور کا جائزہ لیا جائے تو ان کے کلام کی مندرجہ ذیل خصوصیات نظر آتی ہیں؛

۱۔ احساسِ دردمندی اور سوزِ غم

میر کے کلام کا مطالعہ کرتے ہوئے ہمیں بے پناہ رنج و ملال اور غم واندوہ کا احساس ہوتا ہے ان کے یہاں حُزن و یاس اور درد کی جو کیفیت ملتی ہے اِن کے اشعار میں محسوس کے جاسکتی ہے۔

عہدِ جوانی رو رو کاٹا پیری میں لیں آنکھیں موند
یعنی رات بہت تھے جاگے، صبح ہوئی آرام کیا

ہم کو شاعر نہ کہو میرؔ کہ صاحب ہم نے
درد و غم کیے جمع تو دیوان کیا

ٹک میرؔ جگرِ سوختہ کی جلد خبر لے
کیا یار بھروسہ ہے چراغِ سحری کا

۲۔ رمزیت و ایمائیت

شاعری خصوصاً غزل، رمز و ایمائیت کا فن ہے یعنی بات کو ڈھکا چھپا کر بیان کرنا ہی غزل کی جان ہے اور اس کا ثبوت میر کے ان اشعار سے ملتا ہے۔

کہا میں نے گُل کا ہے کتنا ثبات
کلی نے یہ سن کر تبسم کیا

یاسِ ناموس عشق تھا ورنہ
کتنے آنسو پلک تک آئے تھے

۳۔ نغمہ و موسیقیت

میر کی زیادہ تر غزلوں میں نغمگی یا موسیقیت کا عنصر بہت نمایاں ہے۔ وہ اپنے کلام میں سادہ، نرم اور لطیف الفاظ کو اس چابکدستی اور سلیقہ مندی سے استعمال کرتے ہیں کہ لفظوں کے زیر و بم سے غُنایت پیدا ہو کر ساری فضا کو مترنم کرنے لگتی ہے۔ مثلاً

چلتے ہو تو چمن کو چلیے کہتے ہیں کہ بہاراں ہے
پات ہرے ہیں، پھول کھلے ہیں کم کم بادو باراں ہے

M.HARIS BASIM

اُلٹی ہوگئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا
دیکھا اس بیماری دل نے آخر کام تمام کیا

پتہ پتہ، بوٹا بوٹا حال ہمارا جانے ہے
جانے ہی نہ جانے گل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے

۴۔ آفاقیت

میر کا غم محض انفرادی یا ذاتی نہیں بلکہ اجتماعیت کا حامل ہے۔ اگر چہ ان کا تمام کلام بنیادی طور پر انکی ذات اور معاشرت کا ترجمان ہے لیکن انہوں نے اپنی بالغ نظری، نفسیاتی نکتہ رسی اور شبنمی نگاہ کے اثر سے اپنے اشعار کو پورے عالم انسانیت کی آواز بنا دیا اور اسطرح عالمگیر قدروں کو اُجاگر کیا۔

لے سانس بھی آہستہ نازک ہے بہت کام
آفاق کی اس کارگر شیشہ گری کا

جائے ہے جی نجات کے غم میں
ایسی جنت گئی جہنم میں

۵۔ عظمتِ آدم

میر کی غزلوں میں انسانی عظمت اور اعلیٰ اقدار کا پرچار اس تسلسل سے ہے کہ یہ موضوع بھی ان کی غزلوں کی پہچان بن گیا ہے اور یہی انداز بیان ادب پیرائے زندگی کی ترجمانی کرتا ہے۔

مت سہل ہمیں جانو، پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

آدمی کو فلک سے کیا نسبت
شان ارفع ہے میرؔ انسان کی

۶۔ تصوّف

میر کی شاعری میں جو تصوف یا اسرار و معرفت کی ضوفشانی ہے وہ ان کی قلندرانہ مزاج اور درویشانہ زندگی کا آئینہ دار ہے۔ وجہ یاران نکتہ داں کیلئے صلائے عام رکھتا ہے۔

تھا تو وہ رشکِ حورِ بہشتی ہمی میں میرؔ
سمجھے نہ ہم تو ضعم کا اپنی قصور تھا

لایا ہے میرا شوق مجھے پردے سے باہر
میں ورنہ وہی خلوتی راز نہاں ہوں

۷۔ اسلوبِ بیان

M.HARIS BASIM

میر کا تمام کلام سادہ، عام فہم اور پُر اثر ہے۔ دھیما لہجہ، سبک اندازِ بیان، نرم اور کومل الفاظ، نادر تشبیہات و استعارات انکے اسلوب کی خاص پہچان ہیں جو شعر کی اثر انگیزی میں جادو سا بھر دیتی ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ان کا دُرویشانہ لب ولہجہ بھی ان کے طرز حیات ونظریات کی عکاسی کرتے ہوئے انہیں انفرادیت کرتا ہے۔

فقیرانہ آئے، صدا کر چلے
میاں خوش رہو ، ہم دُعا کر چلے

ہم فقیروں سے کج ادائی کیا
آن بیٹھے جو تم نے پیار کیا

۸۔ میرؔ نقادوں کی نِگاہ میں

میر کی شاعرانہ عظمت کو اُردو ادب کے تمام ہی نقادوں نے اپنے اپنے الفاظ میں خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔ مثلاً مجنوں گورکھپوری کی نگاہ میں "میر شہنشاہِ سخن ہی نہیں بلکہ خدائے سخن ہیں ان کا کلام جیسا کہ ان کے زمانے میں مشہور تھا آج بھی ویسا ہی مقبول ہے۔"

بابائے اُردو مولوی عبدالحق کے بقول "اگر دنیا کے ایسے شعراء کی فہرست تیار کی جائے جن کا نام ہمیشہ ہمیشہ زندہ رہے گا تو میر کے نام کے بغیر یہ فہرست قطعی نامکمل رہے گی۔"

۹۔ میر شعراءِ اُردو کی نظر میں

ناقدان شعر وادب کی طرح تقریباً تمام ہی بلند پایہ شعراء نے بھی میرؔ کے کمالِ فن کا اعتراف کرتے ہوئے نذرانہ عقیدت پیش کیا ہے۔

استاد ذوقؔ

نہ ہوا پر نہ ہوا میرؔ کا انداز نصیب
ذوقؔ یاروں بہت زور غزل میں مارا

مرزا غالبؔ

ریختہ کہ تم ہی استاد نہیں ہو غالبؔ
کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میرؔ بھی تھا

حسرتؔ موہانی

شعر میرے بھی ہیں پُردرد لیکن حسرتؔ
میرؔ کا شیوہ گفتار کہاں سے لاؤں

اکبر الہ آبادی

میں ہوں کیا چیز جو اس طرز پہ جاؤں اکبرؔ
ناسخؔ و ذوقؔ بھی جب چل نہ سکے میرؔ کے ساتھ

نواب شیفتہؔ

نرالی سب سے ہے اپنی روش اے شیفتہؔ لیکن
کبھی دل میں ہوائے شیفتہ ہائے میرؔ پھرتی ہے

M.HARIS BASIM

خواجہ میر درد

مختصر حالات زندگی

خواجہ میر درد ایک معروف صوفی خاندان کے چشم چراغ تھے۔ والد کا نام خواجہ محمد ناصح اور تخلص عندلیب تھا۔ انہوں نے شاہی ملازمت چھوڑ کر درویشیت اختیار کی۔ درد نے مروجہ دینی علوم کی تحصیل اپنے والد سے ہی کی۔ وہ شروع ہی سے درویش منش اور قانع طبیعت کے مالک تھے۔ چنانچہ کچھ عرصہ ملازمت کرنے کے بعد فقیری اور درویشی اختیار کی۔ اور والد کے انتقال کے بعد انکے جانشین بنے تاریخی اعتبار سے یہ زمانہ مصائب وابتلاء کا زمانہ تھا، دہلی ان دنوں شورشوں اور بیرونی حملہ آوروں کی زد میں تھی۔ ہر طرف بدامنی لوٹ مار اور قتل وغارت کا بازار گرم تھا۔ اس عالم میں دہلی کے علم وفضل رکھنے والے اور شعراء دوسرے مقامات کا رخ کر رہے تھے۔ لیکن خواجہ میر درد نے ان حالات میں صبر واستقامت کا دامن مضبوطی سے تھامے رکھا۔ اور صبر واستقلال کے ساتھ ہر قسم کے حالات میں دہلی میں مقیم رہے۔

شاعرانہ خصوصیات

میر درد دورِ اول کے ایک منفرد اور مایہ ناز شاعر تھے۔ ان کے یہاں موضوعاتِ شاعری اور طرز ادائیگی میں ندرت، تازگی اور شگفتگی پائی جاتی ہے وہ ایک درویش کامل خوش ذات، نیک صفات اور صالح انسان تھے۔ چنانچہ انکی شاعری میں صوفیانہ افکار کی خوبصورت عکاسی ملتی ہے۔ ان کی شاعرانہ صفات مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ تصوف

میر درد نے بڑی خوبی سے تصوف کو غزل کے سانچے میں ڈھالا اور خشک صوفیانہ افکار وخیالات کو نہایت سادگی صفائی، لطافت اور شگفتگی کے ساتھ زبان شعر میں ادا کیا۔ تصوف انکے نزدیک محض ایک نظریہ یا تصور نہیں بلکہ زندگی کا ایک تجربہ بن کر سامنے آیا ہے۔ وہ کائنات کا مطالعہ اور مشاہدہ ایک صوفی کی نظر سے کرتے ہیں۔

جگ میں آکر ادھر ادُھر دیکھا
تو ہی آیا نظر جدھر دیکھا

خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سُنا افسانہ
قاصد نہیں یہ کام ترا اپنی راہ لے

۲۔ دردواثر

اثر آفرینی اور دردمندی کلام درد کا بنیادی وصف ہے۔ اگر چہ دیوان ان کا مختصر ہے لیکن سرمایہ درد واثر ہے۔ اور بقول محمد حسین آزاد ''درد تلواروں کی آب داری نشتر بھر دیتے ہیں''۔ دراصل خواجہ میر درد ایک مخلص انسان تھے۔ اس لئے انکے کلام کا سرمایہ درد واثر ہونا فطری بات ہے۔

جگ میں کوئی نہ ٹک ایسا ہوگا
کہ دانستہ میر رو دیا ہوگا

۳۔ حوصلہ مندی

صبر وتوکل اور استقامت صوفیائے اکرام کی اہم خصوصیات ہیں۔ خواجہ میر درد کیونکہ عملاً صوفی تھے اس لئے یہ سب باتیں انکے کلام میں ڈھل گئیں ہیں۔ وہ ایک بلند حوصلہ اور عالی ظرف انسان تھے۔ اس لئے انکے کلام میں تلخی دوراں کی شکایت نہیں ملتی۔ درد کا زمانہ تاریخی اعتبار سے مصائب وابتلاء کا زمانہ تھا اور شعراء دلی چھوڑ کر لکھنوء اور دوسرے مقامات کا رخ کر رہے تھے لیکن حالات کی ناسازگاری سے درد کے پائے استقامت میں لرزش نہ آئی۔ اور تمام عمر دلی میں مقیم رہے۔

۴۔ رمزوایماء

رمزوایماء شاعری کی روح اور تغزل کی جان ہے۔ اس سے کلام میں تاثیر اور معنویت دوبالا ہوتی ہے۔ درد کی غزل میں رمزوایماء انکے مخصوص طرز ادا میں رچ بس کر ادا ہوتی ہے۔

ان لبوں نے نہ کی مسیحائی

M.HARIS BASIM

ہم نے سو سو طرح سے مر دیکھا

شمع کی مانند ہم اس بزم میں
چشم نم آئے تھے دامن تر چلے

۵۔ ایجاز و اختصار

دیوانِ درد جہاں مختصر ہے وہاں اس کی غزلیں بھی مختصر ہیں۔ وہ لمبی سے لمبی بات کو اپنے اشعار کے ذریعے مختصر الفاظوں میں بیان کر دیتے ہیں کہ شعر کا پورا حق ادا ہو جاتا ہے اور ان کی یہ خوبی اُن کو اپنے معاصرین پر ترجیح دیتی ہے۔ اور ان کا یہ جادو اُن کی اُردو شاعری میں دلکشی پیدا کر دیتا ہے۔ ان کی اس خصوصیت کے بارے میں محمد حسین آزاد کہتے ہیں کہ؛

"چھوٹی چھوٹی بحروں میں جو اکثر غزلیں کہتے تھے تو گویا تلوار کی ابدادی نشتر میں بھر دیتے تھے۔"

آتشِ عشق قہر ہے آفت ہے
ایک بجلی سی آن پڑتی ہے

بے وفائی پہ اُس کی دل مت جا
ایسی باتیں ہزار ہوتی ہیں

۶۔ سہلِ ممتنع

موزوں ترین الفاظ سادہ الفاظ میں خیال پیش کرنے کا نام سہلِ ممتنع ہے۔ خواجہ میر درد کا کلام سہلِ ممتنع کا عمدہ نمونہ ہے۔ میر جیسی سادگی اور فصاحت اُردو شاعری میں اگر کسی کو نصیب ہوتی ہے تو وہ خواجہ میر درد ہیں۔ رام بابو سکسینہ کہتے ہیں؛

"ان کی غزلیں زبان کی سادگی اور صفائی میں میر کے کلام کا کا مزا دیتی ہیں۔

لوگ کہتے ہیں عاشقی جس کو
میں نے جو دیکھا بڑی مصیبت ہے

آتش عشق جی جلاتی ہے
یہ بلا جان ہی پر آتی ہے

۷۔ عشقِ مجازی

تقریباً نصف دیوانِ درد عشقِ مجازی کی طرفہ کاریوں سے پُر ہے اور یہ حقیقت ہے کہ ان کی رِطافت سینہ طبیعت نے اس سلسلے میں بھی یادگار نمونے چھوڑے ہیں۔ ڈاکٹر سمن ہاشمی کہتے ہیں؛

"درد اپنے عشقِ حقیقی کیلئے مشہور ہیں لیکن اس عشق میں نہ وہ جوش ہے نہ درد و اثر ی جو عشقِ مجازی میں پائی جاتی ہے۔"

جی کی جی میں رہی بات نہ ہونے پائی
ایک بھی اس سے ملاقات نہ ہونے پائی

کسی سے کیا بیاں کیجیے اس اپنے حال ابتر کو

M.HARIS BASIM

دل اس کے ہاتھ دے بیٹھے جسے جانا نہ پہچانا

۸۔ سادگی اور صفائی

درد کی شاعری میں تصوف کے سنجیدہ مسائل کے باوجود سادگی اور صفائی کے جوہر سے مالا مال ہے۔ انکے بعض اشعار اس خوبی میں میر درد سے بھی بڑھے ہوئے ہیں۔ درد کی سادگی بے تکلفی اور بے ساختہ پن کی خوبی ان کے کلام میں خاص اہمیت رکھتی ہے۔

دل زمانے کے ہاتھ سے سالم
کوئی ہوگا کہ رہ گیا ہوگا

۹۔ ضرب الامثال کا درجہ

کسی شعر کی سادگی، صفائی اور تاثیر کا کمال دوسری باتوں کے علاوہ اس بات میں بھی ہے کہ وہ زبان زدِ خاص و عام ہو جائے۔ خواجہ میر درد کے یہاں ایسے اشعار کی کمی نہیں ہے جنہیں ضرب الامثال کا درجہ حاصل ہو۔

وائے نادانی کے وقتِ مرگ یہ ثابت ہوا
خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا

تر دامن پہ شیخ ہماری نہ جائیو
دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں

ان لبوں نے نہ کی مسیحائی
ہم نے سو سو طرح سے مر دیکھا

خدا کے واسطے اس کو نہ ٹوکو
یہی اک شہر میں قاتل رہا ہے

غرض میر درد کا دیوان اگرچہ مختصر ہے لیکن مؤثر اور پُر معنی ہے ان کے بیان میں سنجیدگی رکھ رکھاؤ اور وضع داری پائی جاتی ہے۔

غالبؔ اور اُن کی شاعری اور شاعری کی خصوصیات

غالبؔ زبانِ اردو کے بہت بڑے اور عظیم شاعر، ماہر و آسمانِ شاعری کے سب سے درخشندہ تارے، اپنے زمانے کے استادِ کامل، فلسفی، شاعر اور بہت کچھ تھے۔ مرزا غالب کا پایہء شاعری بہت بلند ہے اور اس کو سب نے تسلیم کیا۔ وہ نہایت وسیع النظر، حلیم الطبع، منکسر اعتراج اور کثیر المعلومات تھے۔ ان کے عنصر پن بھی اُن کی بہت قدرت کرتے تھے۔ متاخرین شعراء اور شعراء سب ہی نے غالب کی عظمت رفتہ کو تسلیم کیا ہے۔ مختصراً یہ کہ غالب ہر صدی کے شاعر ہیں۔

مرزا کو اپنی فارسی ادبی ذانی پر ناز تھا۔ کبھی کبھی وہ منہ کے ذائقہ بدلنے کے لیے اردو میں شعر کہہ لیا کرتے تھے۔ فی البدیہہ اشعار کہنے میں کمال اور قدرتی رکھتے تھے۔ ان کے اسلوب شاعری میں جو چیز نمایاں ہے۔ وہ ان کا سوالیہ / استفہامیہ لب ولہجہ ہے اور اس لب ولہجہ سے ان کی جدت طرازی، مشکل پسندی اور فلسفیانہ طرزِ فکر کا سراغ ملتا ہے۔

اُردو کے جن شاعروں کی عظمت کے بارے مین کوئی اختلاف نہیں ہے۔ وہ میرؔ، غالبؔ اور اقبالؔ کے علاوہ کوئی نہیں ہے۔ میرؔ کا تعلق اٹھارویں صدی سے ہے۔ غالبؔ کا انیسویں صدی سے اور اقبالؔ کا تعلق بیسوی صدی سے۔ لیکن اچھا اور بڑا شاعر صرف اپنے زمانے کا شاعر نہیں ہوتا۔ بلکہ ہر وقت اور ہر صدی کا شاعر ہوتا ہے۔

M.HARIS BASIM

جس طرح کہ غالبؔ ہر صدی کے شاعر ہیں۔ غالبؔ کی انفرادی زرنگار شاعری ہر زمانے میں غیر معمولی حیثیت کی حامل رہی ہے۔ اگر فارسی شاعری میں ان کا مقام نہ ہوتا۔ تب کبھی ان کی اہمیت وعظمت اور اس کے حوالے سے مسلّمہ ہوتی۔ **محاسنِ کلامِ غالب** پر تحقیقی مقالہ لکھنے والے مشہور نقاد ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری مرحوم نے کہا تھا کہ "ہندوستان کی الہامی کتابیں دو ہیں۔ ایک وید مقدس اور دوسرا دیوانِ غالب۔"

اُردو کے مشہور ادیب اور انشاء پرداز رشید احمد صدیقی نے ایک جگہ لکھا ہے کہ "اگر مجھ سے پوچھا جائے کہ مغلیہ سلطنت نے ہندوستان کو کیا دیا میں جواب دوں گا کہ **تاج محل، اردو اور غالبؔ**۔

اور غالب کی عظمت کا راز تو یہی ہے کہ انہوں نے دوسروں کی بنائی ہوئی زبان قبول نہیں کی اور جو زبان وہ خود بنائے گئے وہ ان کے بعد کے شاعروں کے لیے نہ صرف قابلِ قبول ہوئی بلکہ نہایت کارآمد بھی۔ اس زبان میں گہرے اور فلسفیانہ خیالات کو ادا کرنے کی سہولت بھی پیدا ہوگئی۔

علوئے خیال اور ندرت پیما کلام غالب کے خصائص ہیں۔ غالبؔ کے خصائص، قوت متفقیہ اور گہرائی ان کے کلام کو مصنوعیت عطا کرتے ہیں اور غالب کو اسی مقبولیت اور انفرادیت کی وجہ سے ان کے بہت سارے حریف اور مخالف پیدا ہوگئے تھے۔ لیکن ان کے مدّاحوں میں حالیؔ، بجنوریؔ، ڈاکٹر سید محمود، ڈاکٹر صلاح الدین، خدا بخش اور بیخود موہانیؔ وغیرہ شامل ہیں۔ کلامِ محاسن غالب کے اس قدر ہیں کہ اس پر کسی ساری شرحیں لکھی گئیں اور آج شائقین اردو مرزا غالب کے محاسنِ کلام کو اُردو شاعری کو پرستش کی حد تک سراہتے ہیں۔ اور آئندہ بھی جوں جوں اردو زبان وادب میں دلچسپی بڑھتی جائے گی۔ کلامِ غالب سے مدّاحسنِ غالب کا لگاؤ بڑھتا جائے گا۔ کلامِ غالب کے بغیر اُردو شاعری بے وقار ہے اور ایسی دُلہن کے مانند ہے جس کا سہاگ چھن گیا ہو۔

غالب ایک عظیم شاعر اور ایک عظیم نکتہ داں کی شخصیت اور شاعری ایک مزاج ہمہ داں کی صورت میں ہمارے سامنے ہمیشہ جلوہ گر رہے گے۔ لمحات گریزیا ان کی تربت سے لذت آشنا کرنے میں مصروف کار ہیں۔ ان کا شاعرانہ مزاج نئی نئی مضمونیوں سے ہمارے شعوری افق پر محیط ہے۔

حضرت علامہ اقبالؒ ایک عظیم المرتب مفکر اور شاعر نے شہنشاہِ اقلیم سخن غالب یکتائے زمن کو مختلف انداز سے جو مزاجِ تحسین پیش کیا ہے۔ اس سے اہلِ علم بخوبی آگاہ ہیں۔ خصوصاً مرزا کا فارسی کلام خود آگہی، عہدِ مسلسل اور فلسفہ حیات کا آئینہ بے مثال ہے۔ جس کے مطالعے سے علامہ اقبال نے محرمِ راز کو اس طرح بے نقاب دیکھا۔ تو برجستہ یوں گویا ہوئے؛

بآب جو نگرم خویش را زطارہ کنم
بایں بہانہ مگر روئے محرے بینم

(فارسی)

شاہدِ مضمون تصدق ہے تیرے انداز پر
خندہ زن ہے غنچہ دلی گلِ شیراز پر

اقبالؔ، غالب کو گوئٹے کا ہمنوا قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں؛

آہ تو اجڑی ہوئی دلی میں آرامدہ ہے
گلشنِ و پیرہن میں شیرا ہمنوا خوابیدہ ہے

بہرِ کیف **محاسن غالب** اور **محاسنِ کلامِ غالب** تو بہت طُول اور طویل ہیں۔ مختصراً اب غالب کے کلام یعنی شاعری کے خصائص کا جائزہ لیں گے۔

مُحاسنِ کلامِ غالبؔ

غالب کی شاعری تین مراتب یا ادوار پر تقسیم کی جاسکتی ہے۔ جس سے ان کی شاعری کو اور نیز ہر دور کی خصوصیات کا پتہ بخوبی چل سکتا ہے۔ یہ بات پیشِ نظر رکھنا چاہیے کہ غالب اپنی قابلیت اور پانے اردو دیوان کے معیار سے کبھی نہیں جانچنا چاہتے تھے۔ غالب کی شاعری کا پہلا دور میں وہ فارسی آمیز شاعری کرتے تھے۔

اسد تم نے بنائی یہ غزل خوب
ارے او شیر رحمت ہی خُدا کی

M.HARIS BASIM

میں نے مجنوں یہ لڑکپن میں اسد
سنگ اُٹھایا تھا کہ سر یار آیا

طرزِ بیدل میں ریختہ کہنا
اسد اللہ خاں قیامت ہے

مُطرّب دل نے میرے تارِ نفس سے غالبؔ
نازِ پُر رشنہ لیے نغمۂ بیدل باندھا

غالب کی شاعری کا دوسرا دور وہ دور ہے جب ان کے کلام سے فارسیت کا غلبہ ختم ہو چکا تھا اور تیسرا ان کی شاعری کا وہ دور ہے جب ان کے کمالِ فن کا لب لباب اور ارتقائے کمال کی آخری منزل ہے۔ اس میں بعض اشعار جامعیت اور اختصار میں فی الحقیقت اپنا جواب نہیں رکھتے۔ اس عہد کی غزلوں میں ندرتِ خیال کے ساتھ لطافت اور شگفتگی کلام عجیب لطف دیتی ہے۔ ان میں ایجاز کے ساتھ سادگی، سلاست، روانی خیالی تخیل سب کچھ بدرجہ احسن موجود ہے اور ان ہی وجوہات کی بناء پر وہ شعراء، شعراءِ اردو کے صف میں ہے۔ ذیل میں ہم غالب کی شاعری کے محاسن اور خصوصیات کا جائزہ لیں گے۔

۱۔ جدّت پسندی

مرزا کی جدت کی شاعری اور قصرِ شاعری کی بنیاد ان کی جدت طرازی پر مستحکم ہے۔ جس میں جدّتِ تخیل، جدّتِ طرز، جدّتِ تشبیہات، جدّتِ استعارات، جدّتِ محاکات اور جدّتِ الفاظ غرض ہر قسم کی جدتیں شامل ہیں۔ پامال مضامین مرزا صاحب کی خاص طرزِ ادا سے بالکل نئے معلوم ہونے لگتے ہیں اور وہ معمولی سے معمولی واقعات بھی اپنے جدّتِ اسلوب سے اس طرح بیان کر جاتے ہیں۔ کہ گویا اُن سے پہلے کبھی نہیں سُنے گئے تھے۔ غالبؔ کے یہاں الفاظ خیالات کے تابع ہوتے ہیں۔

پکڑے جاتے ہیں، فرشتوں کے لکھے پر ناحق
آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا

میں نے کہا کہ بزمِ ناز چاہیے غیر سے تہی
سُن کے ستم ظریف نے مجھکو اٹھا دیا کہ یُوں

۲۔ نظرِ فریبِ تحریر

غالب کی شاعری کی دوسری اور اہم خصوصیت ان کے کلام کی نظرِ فریب تحریر ہے۔ وہ بات سے بات پیدا کرتے ہیں۔ وہ ایک سُر چھیڑتے ہیں اور سامع کا ذہن پورا راگ مذ ضبط کرتا ہے۔ مرزا صاحب کی شاعری کا خاص طرّہ امتیاز جادۂ کام سے علیحدگی ہے۔ ان کے اشعار سے نظر فریبی مقرشح ہے۔ وہ عام باتوں سے سخت متغیر تھے۔

کیا آبروئے عشق جہاں عام ہو جفا
ڈرتا ہوں تم کو بے سبب آزاد دیکھ کر

غالب خیالات کو الفاظ کی قید سے توڑ دیتے ہیں۔ آبگینہ تندیِ صہبا سے پگھلا جائے ہے۔

۳۔ ذاتی جذبات کا ادا کرنا

مرزا کے کلام کی ایک بڑی خصوصیت ان کے اشعار ان کے خیالات کا صحیح فوٹو ہوتے ہیں۔ وہ اپنے اشعار زندگی کی مختلف کیفیات کے ترانے گاتے ہیں۔ وہ اپنے اشعار کے زریعے سے اپنی دلی کیفیات پیش کرتے ہیں اور ان کیفیات میں کہیں رنج والم ہے، سوز وگداز ہے، تو عشق کا سرور ہے اور مستی ہے۔ کہیں ان کی ماندعظمت کا مرقع ہے۔ تو کہیں حرمان نصیبی اور رنج وخوشی کا یہ سنگم ان کے لطف اشعار سے ظاہر ہے۔

تسکین کو ہم نہ روئیں جو ذوق نظر ملے
حورانِ خلد میں تیری صورت مگر ملے

گر خامشی سے فائدہ اخفائے حال ہے
خوش ہوں، کہ میرے بات سمجھنی محال ہے

ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسدؔ
عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

۴۔ فلسفیت اور حقیقت طرازی

مرزا ایک بڑے فلسفی شاعر ہیں اور ان کے اکثر اشعار حقائق فلسفہ کو نہایت آسانی اور سادگی سے ظاہر کرتے ہیں۔ وہ رموز حقائق تصوف سے پوری طرح واقف اور رمز قہ بندی اور مذہبی تعصّبات سے بالکل مبرّا تھے۔

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم
ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایمان ہوگئیں

ہے پرے سرحد ادراک سے اپنا مسجود
قبلہ کو اہلِ نظر قبلہ نما کہتے ہیں

۵۔ حقیقت طرازی

زندگی کی حقیقت کو اور فلسفے کو اس قدر اغراق سے بیان کرتے ہے۔ جنت کے اس خیال سے کہ اس میں نہریں جاری ہونگی اور وہی سب لطف ہونگے۔

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کو خوش رکھنے کو غالبؔ یہ خیال اچھا ہے

۶۔ جذبات نگاری

مرزا صاحب کی شاعری جذبات سے مملو ہے۔ زندگی اور اس کے غم ولازم وملزوم ہیں۔ اسی لیے کہتے ہیں

غم اگرچہ جان گُسل ہے۔ پہ بچیں کہاں کہ دل ہے
غمِ عشق اگر نہ ہوتا ۔ غمِ روزگار ہوتا

قیدو حیات وبندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

۷۔ ظرافت وشوخی

M.HARIS BASIM

جذبات نگاری کی اس قدر گہرائی کے ساتھ ساتھ غالبؔ اپنی شاعری میں ظرافت اور شوخی بھی بسائے ہوئے ہیں۔ جہاں ان کی شاعری میں تاریکی ہے وہاں ان کی طبعی ظرافت اور شوخی اسے اکثر دور کر دیتی ہے۔ ان کے کلام کی ظرافت اور لطافت اور شوخی کلام کی نزاکت کو ہم ایک بے تکلف اور نازک پھول سے تشبیہہ دے سکتے ہیں۔ ان کے اکثر اشعار نفیسِ شاعری کی جان اور فصاحتِ و بلاغت کے رُوحِ رواں ہیں۔

نیند اس کی ہے، دماغ اس کا ہے، راتیں اس کی ہیں
تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہوگئیں

۸۔ غالبؔ کی شاعری کا اہم عنصر استفہام

غالب کے شاعرانہ اسلوب میں جو چیزیں شامل ہیں اور نمایاں ہیں وہ ان کا سوالیہ یا استفہامیہ لب ولہجہ ہے۔ اس لب ولہجہ سے ان کی جدّت طرازی، مشکل پسندی اور فلسفیانہ طرزِ فکر تینوں چیزوں کا سراغ ملتا ہے۔ کلماتِ استفہام کے استعمال سے فائدہ شاعری میں انہوں نے اٹھایا ہے۔ کسی دوسرے اردو شعراء نے نہیں اُٹھایا۔ مثلاً استفہامیہ شعر ہے؛

اس سادگی پہ کون نہ مرجائے اے خُدا
لڑتے ہیں اور ہاتھوں میں تلوار بھی نہیں

دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے
آخر اس درد کی دوا کیا ہے

شاعر کو نوا ہو کہ مفتی کا نفس ہو
جس سے چمن افسردہ ہو وہ بادِ سحر کیا

دل ہر قطرہ ہے سازِ انا البحر
ہم اس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا

کبھی کبھی ان کے حُروف بیان اور حرفِ انکار سے استفہامیہ انداز پیدا ہو جاتا۔

خوشی سے نہ مرجائے اگر اعتبار نہ ہوتا
گرانی تھی برق ہم پر نہ کہ کوہِ طور پر

غالب شاعر منفرد، اس اور منصب عظیم پر فائز ہیں۔ غالب ہر صدی کے شاعر ہیں۔ اگر **دیوانِ غالب کو اردو ادب** سے خارج کر دیا جائے تو اردو ادب کا پلّہ ہلکا ہو جائے گا۔

غالب اور نقاد

۱۔ میر کو جب غالب کے چند اشعار دکھائے گئے تو انہوں نے کہا۔ اگر اس لڑکے کو کوئی استاد کامل مل گیا اور اس نے اسے سیدے راستے پر ڈال دیا تو لاجواب شاعر بن جائے گا ورنہ مہمل بکنے لگے گا۔ (یادگار غالب)

۲۔ ہندستان میں الہامی کتابیں صرف دو ہیں ایک تو وید مقدس اور دوسری دیوانِ غالب۔ (ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری)

۳۔ خسرو اور فیضی کے بعد کوئی ایسا جامع الحیات آدمی ہند کی سرزمیں سے نہیں اٹھا۔ (الطاف حسین حالی)

۴۔ مجھ سے اگر پوچھا جائے کہ ہندوستان کو مغلیہ سلطنت نے کیا دیا تو میں بے تکلف تین نام لوں گا۔

M.HARIS BASIM

(۱)غالب (۲)اردو (۳)تاج محل (رشید احمد صدیقی)

۵۔ خلق کو سو ناز ہے تیرے لب و اعجاز پر (حکیم الامت علامہ اقبال)

اقبال اور ان کی شاعری

اقبال شاعرِ مشرق، حکیم الامت، شاعرِ اسلام اور شاعرِ امروز و فردا کے نام سے مشہور ہیں۔ ایک وسیع النظر شاعر ہیں۔ انہوں نے مشرق و مغرب دونوں کا عمیق مطالعہ کیا ہے۔ وہ ایران کے علاوہ ہندوستان کے فلسفہ سے بخوبی واقف ہیں اور ادب میں ان کا فارسی تبحّر بخوبی ظاہر ہوتا ہے۔ انگلستان سے واپسی پر شعر و شاعری شروع کی۔ اقبال کی شاعری کے متعین دور صاف طور پر نظر آتے ہیں۔ پہلا دور ۱۸۹۹ء سے ۱۹۰۵ء تک ہے جب وہ ولایت روانہ ہوئے۔ اس زمانے کے کلام میں ان کی لمبائی کی جھلک اور ان کی سحر نگاری کی ابتداء نظر آتی ہے۔ ان کی شاعری کا دوسرا دور ۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۸ء تک کا ہے جب وہ سخت قسم کے ملّی شاعر تھے اور تیسرا دور ۱۹۰۸ء انگلستان کی واپسی پر شروع ہوتا ہے۔ جب ان کی مشقِ شاعری کمال دُور تک پہنچ گئی تھی۔ کلام زور اور شیریں بیانی ہے۔ وطنیت اور ملیت کا عنصر غالب ہے۔ اقبالؒ کی شہرت کا راز ان کی طویل نظموں میں ہیں۔ جب میں ان کی شاعری کا رنگ اور تخیل پایا جاتا ہے۔ ان ہی نظموں میں انہوں نے اپنے خاص شاعرانہ جوہر دکھائے ہیں اور فلسفہ و تصوف اور حبّ وطن کے جذبات کے ساتھ ساتھ بہترین شیستہ و رفتہ زبان، سلاست بیان، روزِ تخیل، جذب و اثر اور استعارے اور تمثیلیں بھی ان میں پائی جاتی ہیں۔

اقبال کا جذبہ حبِ وطن انہیں آفاقی شاعر عظیم بنا گیا۔ ان کی مشہور نظمیں ہمالہ خضرِ راہ، شمع و شاعر، شکوہ، جوابِ شکوہ، نیا شوالہ وغیرہ ہیں۔

مُحاسنِ کلامِ اقبال

۱۔ جذبہ حب الوطنی

ان کی شاعری کا غالب عنصر وطن کی محبت ہے اور اسی وجہ سے ان کی پہلی نظم **ہمالہ** میں یہ عنصر تمام جذبات پر غالب ہے۔ صدائے دور میں یہ خیال اور بھی پختہ ہے۔ وطن کے مصائب اور خرابیوں کے اسباب انہوں نے پُرخوش طریقے سے بیان کیے ہیں اور مذہبی تعصب کی تشریح کی ہے۔ ترانہ ہندی اور قومی گیتوں سے جزبہ حب الوطنی کو معمور کرتے ہیں۔ ان کی قومی گیتوں کی مقبولیت اور ہر دلعزیزی کا پورے ہندوستان میں چرچا تھا اور آج بھی ہے۔ نظم شوالہ جو پوری وطنیت کے جذبے میں ڈوبی ہوئی ہے اس کے چند اشعار یہ ہیں؛

سچ کہدوں ، اے برہمن گر تُو برا نہ مانے — تیر صنمکدوں کے بُت ہوگئے پُرانے
اپنوں سے بیر رکھنا تو نے بتوں سے سیکھا — جنگ و جدل سکھایا واعظ کو بھی خُدا نے
تنگ آکے میں نے آخر دیر و حرم کو چھوڑا — واعظ کا وعظ چھوڑا چھوڑے نے جا فسانے
پتھر کی مورتوں میں سمجھتا ہے تو خُدا ہے — خاکِ وطن کا ہر ذرہ مجھکو دیوتا ہے

۲۔ اسلام کی گہری عقیدت اور محبت کا اظہار

جذبہ حب الوطنی کے علاوہ اقبال کو اسلام سے گہری عقیدت اور محبت تھی۔ جیسے انہوں نے اپنی نظموں جنگِ یرموک کا واقعہ، شکوہ اور جوابِ شکوہ میں ظاہر کیا۔ اقبال ساری دنیا کے مسلمانوں سے ملتجی ہیں کہ اگر تم اپنی ہستی قائم قائم رکھنا ہے۔ تو مذہبی اختلاف ترک کردو۔ اخوت اور مساوات میں آجاؤ۔ اسلام کے سانچے میں ڈھل جاؤ۔ وہ کہتے ہیں کہ؛

یہ مقصودِ فطرت ہے ۔ یہی رمزِ مسلمان
اخوت کی جہانگیری محبت کی فراوانی

بُتانِ رنگ و خوں کو توڑ کر ملّت میں گم ہوجا

M.HARIS BASIM

نہ تورانی رہے، باقی نہ ایرانی نہ افغانی

قوم مذہب سے ہے ، مذہب جو نہیں تم بھی نہیں
جذبِ باہم جو نہیں ، محفلِ انجم بھی نہیں

۳۔ امید و مسرت کا عنصر

اقبال مخزون و مایوس شاعر نہیں ان کے کلام میں امید اور مسرت جلوہ گر ہے۔ بلکہ یہی چیز ان کو انکے معاصرین سے ممتاز کرتی ہے۔ وہ اس تاریک فضاء سے کبھی مایوس نہیں ہوئے۔ ان کا عقیدہ ہے کہ مصائب اور ناکامیاں انسان کے کردار کو مضبوط اور پختہ کرتی ہیں۔ تاریک راستے اور دُشواریاں ایک درخشاں مستقبل کا خواب دکھاتے ہیں۔ ناکامیوں کے بادل کے پیچھے امید کے چراغ جلوہ گر کرتے ہیں۔

تورازِ کن مکاں ہے اپنی آنکھوں پر عیاں ہو جا
خودی کا رازداں ہو جا، خدا کا ترجمان ہو جا

۴۔ ملّی کوشش اور عملِ پیہم کی شاعری

باوجود عملی شاعر ہونے کے وہ بہت بڑے تاریخی شاعر بھی تھے۔ وہ گزشتہ زمانے کی تصویر اس کے تاریک رنگ کا مرقع نہایت چمکتے ہوئے رنگوں میں کھینچتے ہیں۔ وہ اس لیے کہ مسلمان اُس سے ایک مفید سبق حاصل کریں۔ اپنی غفلت چھوڑ دیں، اور سعی و کوشش سیکھیں۔ مثلاً عملی کوشش کے لیے اقبال کا پیغام ہے کہ؛

یہی آئینِ فطرت ہے ۔ یہی اسلوب و فطرت ہے
جو ہے راہِ عمل میں گامزن محبوبِ فطرت ہے

۵۔ نیچرل (قدرتی مناظر کی عکاسی) نظمیں

اقبال کی شاعری کا ایک حسنِ اسلوب یہ بھی ہے کہ ان کی قدرتی مناظر کی عکاس نظمیں بھی ہیں جنہیں نیچرل کا نام دیا گیا ہے۔ وہ چیزیں جو قدرتی مناظر میں اپنا مقام رکھتی ہیں۔ مثلاً جگنو، چاند، صبح کا ستارا، ایک پرندہ اور جگنو، ابر وغیرہ اعلیٰ تخیل، صحت بہا اور شیریں بیانی کی وجہ سے لاجواب ہیں۔ ان میں طفلانِ مسرت اور اصلیت کا جوش پایا جاتا ہے۔ مناظرِ قدرت کی عکاسی ان کا من و عن بیان ان کی شاعری میں حلاوت اور لطف اندوزی گھولتی ہیں۔ انہوں نے کلام فرسودہ طریقوں کو چھوڑ اکر ایک نیا انداز اپنایا ہے۔

خیاباں میں ہے منتظر لالہ کب سے
قبا چاہیے اس کو خونِ عرب سے

سادہ و پرسوز ہے چترِ دہقان کا گیت
کشتی دل کے لیے سہل ہے عہدِ شباب

۶۔ تشبیہات اور استعارات کی استعمال

اقبال نے اپنے شعروں کی سچائی اور حقیقت سمجھانے کے لیے کہیں کہیں اپنی شاعری میں تشبیہات اور استعارات کا بھی استعمال کیا اور تلمیحات بھی استعمال کی ہیں۔

ہر دل نئے خیال کی مستی میں چُور ہے
کچھ اور آج کل کے کلیموں کا طور ہے

لوئے دیمن آج بھی اس کی ہواؤں میں ہے

M.HARIS BASIM

رنگِ حجاز آج بھی اس کی نواؤں میں ہے

۷۔ خودی کا اور بندگی کا پیغام

اقبال کی شاعری کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ انسان کو خودی کی حقیقت اور اس کی معرفت پہنچاتے ہیں۔ اپنی شاعری سے انسان کو یقین دلاتے ہیں کہ وہ خود کیا ہے اور اسے کیا کرنا چاہیے۔ انسان جسے اللہ تعالیٰ نے تسخیر کائنات کو دی۔ چونکہ انسان باعث تخلیق کائنات ہے۔ اسی لیے انسان کو اس طرح پیغام دیتے ہیں۔ وہ خودی کا پیام کچھ اس طرح سناتے ہیں۔

خودی کا راز داں ہوجا خدا کا ترجمان ہوجا
تو میرا نہیں بنتا تو نہ بن اپنا تو بن جا

نہ تو زمین کے لیے نہ تو آسمان کے لیے
جہاں ہے تیرے لیے تو نہیں جہاں کے لیے

۸۔ آفاقی پیام اور جذبہ تحریک کا عمل

اقبال کی شاعری آفاقی پیام کی جو رہتی دنیا کے لیے مشعلِ راہ ہے۔ اقبال کے نزدیک انسان اپنے بلند عزائم اور جذبہ تحریک عمل اور ادراک و جذبوں کے سبب اس مرتبہ پر فائز ہے کہ اسے عظمتِ دوام حاصل ہے۔ جبریت کا مسئلہ ان کے سامنے کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ انسان تو اس مقام پر فائز ہوتا ہے کہ زمین ہنگامے اسے مغلوب نہیں کر سکتے۔ اور نہ ہی اندیشہ افلاک سے وہ ذہنی پستی کی طرف مائل ہوسکتا ہے۔ وہ دور بین نگاہوں اور بصیرت افروز دل کے سبب ایسا روشن ضمیر ہوتا ہے کہ نہ صرف حال بلکہ مستقبل پر بھی نگراں اور محیط ہوتا ہے۔

حادثہ جو ابھی پردہ افلاک میں ہے
عکس اس کا مرے آئینہ ادراک میں ہے

بستے ہیں مری کارگر فکرِ میں انجم
لے اپنے مقدر کے ستارے کو تو پہچان

اقبال کی شاعری کا ہر دور ایک ہی فلسفہ حیات کا حامل ہے۔ ان کے افکارِ عالیہ اردو ادب میں زنجیریں توڑ کر ہوا میں بلند ہوئے۔ اقبال کے بے تاب جلوے اردو کا لباس پہنتے رہے۔ اُن کی شاعری حزن و یاس سے پاک ہے۔ اقبال کی شاعری تغزل بھی ہے اور ترنم بھی اور شوکتِ الفاظ بھی۔ خیالات کی بلندی اور گہرائی بھی ان بہت سے اوصاف کے ساتھ ساتھ اقبال کی شاعری ایک پیغام عمل ہے۔ جو فلسفہ حرکت و حیات ہے، جو دعوت ہے اور شاعری کی جان ہے۔ ملّت کے وجود میں اجتماعی طور پر اگر شاعر کا وجود سرتاپا پیام عمل نہ ہو تو کچھ بھی نہیں۔ جیسا کہ قاضی عبدالغفار نے ایک جگہ فرمایا ہے کہ **شعر ایک الہام ہے**۔ جو شوکتِ الہام نہیں وہ شعر نہیں محض ایک نظم ہے۔ عقل اور عشق کے اس مجارے میں اقبال عشق ہی عشق ہیں۔ ان کا تفکر سراپا مشرقی ہے۔

تنقیدی آراء

اہم ناقدین نے اقبالؔ کی شاعری پر اپنے خیالات کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے۔

پرفیسر عبدالقادر سروری کہتے ہیں کہ میرؔ اور غالبؔ کی شاعری کو چھوڑ کر اردو میں سوائے اقبال کے کوئی ایسا شاعر نہیں ملے گا جس نے زبان پر اتنا گہرا اثر ڈالا ہو جتنا اقبالؔ نے ڈالا ہے۔

عبدالقادر ندید کہتے ہیں کہ اقبال اردو شاعری میں ایک ایسے دور کے موجد ہیں جس کا بڑا وصف رفعت خیال اور فلسفیانہ بلند آہنگی ہے۔ وہ جس طرح اپنے عہد کی صداقت کے شعارانہ پیداوار ہیں اسی طرح فکر و سخن کی تاریخ میں ایک نئے عنصر کے معمار بھی ہیں۔

W.HARIS BASIM

سردار جعفری کہتے ہیں۔اقبال برصغیر کے ہی نہیں بنی نوح انسان کی لازوال تہذیب کے ایک برگزیدہ مفکر شاعر کی حیثیت سے ہمیشہ یاد کئے جائیں گے۔
غرض کہ یہ کہنا بے جا ہوگا کہ یہ اردو ادب کی خوش نصیبی ہے کہ اسے اقبال جیسا عظیم مفکر، فلسفی اور شاعر نصیب ہوا۔انکی شاعری ایک پیغام ہے جس میں جوش اور جذبے کی فراوانی ہے فکر و عمل کا انقلاب ہے۔حُریت اور آزادی کی تحریک ہے۔اِن کا پورا فلسفہ اور پیغام اللہ تعالیٰ اور اُسکے رسول صلی اللہ علیہ وسلّم کے احکام اور فرمان کے تابع ہے۔یہی وہ تمام خصوصیات ہیں جس نے انہیں حکیم الامت اور شاعرِ مشرق کے لقب سے سرفراز کیا۔

حسرتؔ موہانی

حالاتِ زندگی

نام سید فضل الحسن، تخلص حسرت، کانپور کے قریب ضلع اناؤ (یوپی) کے ایک قصبے موہان میں ۱۸۷۵ء میں پیدا ہوئے۔والد کا نام سید اظہر حسن ہے۔ان کے جدّ اعلیٰ سید محمود نیشاپور سے ترکِ وطن کر کے موہان آ بسے تھے۔حسرت کی تبدائی و دینی تعلیم موہان کے ایک متکب میں ہوئی۔وہیں سے انہوں نے مِڈل کا امتحان پاس کیا اور صوبہ بھر میں اوّل رہے۔اس کے بعد والد صاحب کے پاس فتح پور چلے گئے۔وہاں سے ۱۸۹۵ء میں میٹرک کا امتحان پاس کیا۔۱۹۰۲ء میں علی گڑھ یونیورسٹی سے بی۔اے کیا۔

حسرتؔ نے طالبعلمی ہی کے زمانے میں سیاست میں حصہ لینا شروع کر دیا تھا۔بی اے کرنے کے بعد انہوں نے ایک ادبی اور سیاسی پرچہ اردوئے معلیٰ کے نام سے جاری کیا۔جس کی ادارت کے علاوہ باقی سارا کام وہ خود انجام دیتے تھے۔کتابت کا پتھر پر جمانا، چھاپنا، شیرازہ بندی، خریداروں کو ترسیل۔۔۔یہ تمام کام صرف حسرت ہی کرتے تھے گویا وہ بیک وقت مدیر، پریس مین اور ڈسپیچ کلرک سبھی کچھ تھے۔اس پرچے میں ایک باغیانہ مضمون **مصر میں انگریز کی پالیسی** چھاپنے پر ڈیڑھ برس قیدِ بامشقت کی سزا پائی تھی اور اس بناء پر اردوئے معلیٰ بند ہو گیا تھا۔

حسرت ایک ہمہ گیر اور مُتنوع شخصیت کے مالک تھے۔وہ ایک غزل گو ہونے کے علاوہ بھی بہت کچھ تھے۔ان کی زندگی بڑی درویشانہ تھی۔بڑے سادگی پسند، قانع، منکر المزاج اور صُلح کن انسان تھے۔حسرت جیسی مخلص شخصیت کے حامل انسان کبھی کبھی پیدا ہوتے ہیں۔مولانا زندگی بھر حق و صداقت کی راہ پر گامزن رہے۔سیاسی زندگی میں ان کا مُجاہدانہ کردار، آزادی کی راہ میں قید و ہند کی صعوبتیں صرف اِن ہی کی شخصیت کا وطیرہ تھیں۔سیاسی رنگ میں ان کا مجاہدانہ کردار ہمیں بڑے بڑے رہنماؤں میں نظر نہیں آتا۔وہ مسلم لیگ کے رُکن تھے۔لیکن پاکستان بن جانے کے بعد، دوسرے مسلک لیگی لیڈروں کے برخلاف ہندوستان ہی میں رہ گئے تھے تاکہ بھارتی مسلمانوں کی نمائندگی کر سکیں۔حسرت موہانی امیر اللہ تسلیم کے شاگرد ہیں۔تسلیم اگرچہ خود لکھنوی ہیں لیکن انہوں نے مومنؔ کی شاگردی اختیار کی ہوئی تھی۔حسرت نے تسلیم کا رنگ اور تسلیم نے مومنؔ کا رنگ سیکھا تھا۔تاہم حسرت کا ایک منفرد رنگ ہے۔حسرت نے غزل کو ایک نیا وقار اور نئی زندگی عطا کی ہے۔

مُحاسنِ کلامِ حسرتؔ

(حسرت موہانی کی شاعری کی خصوصیات)

ہے زبانِ لکھنؤ میں رنگِ دہلی کی نمود
تجھ سے حسرت نام روشن شاعری کا ہو گیا

اپنی تعریف حسرت خود اپنے اِس شعر میں کرتے ہیں اور حقیقت بھی یہی ہے۔یقیناً رومانوی شعراء میں مومنؔ کے بعد حسرتؔ کا ہی نام آتا ہے۔حسرت جنہیں **رئیس المتغزلین** کے لقب سے ممتاز کیا گیا ہے ان کے یہاں بھی بلا کا تغزل پایا جاتا ہے۔حسرت کی شاعری میں بڑی رجائیت اور استغناء ہے۔

حالی نے یُوں تو مقدمۂ شعر و شاعری میں شاعروں کو سادگی اور صداقت کی تعلیم دیکر حسرت کے لیے راہ ہموار کر دی تھی۔لیکن کچھ ایسی غلط فہمیاں پیدا کر دی تھیں کہ ایک زمانے تک حالیؔ کو غزل کے مخالف اور نظم کے طرفدار کی حیثیت سے یاد کیا جاتا رہا۔نتیجہ یہ ہوا کہ ہماری اس وقت کی مغربی تعلیم یافتہ نسل رفتہ رفتہ غزل کی مخالف ہوتی گئی۔ایسے پُر آشوب دور میں حسرت نے غزل کے احیاء کا بیڑہ اُٹھایا۔قدیم شعراء کا مطالبہ کیا۔ان کی صحتمند اور ترقی پسند روایات کو اپنایا۔غزل کی زبان جو رعایتِ لفظی سے پُر تکلف ہو گئی تھی اسے سادگی کی طرف لگایا اور حسن و عشق کے مضامین جنہیں حالی نے اخلاقی اور مقصدی جذبہ کے تحت شہر بدر کر دیا تھا انہیں پھر بڑے سلیقے

M.HARIS BASIM

سے غزل میں سجایا۔ مختصر یہ کہ غزل کے مردہ جسم میں نئے سِرے سے روح پھونکی اور اسے وہ توانائی بخشی کہ آج بھی اُردو کی دیگر اصناف کو آج بھی غزل سے آنکھیں چار کرنے کی ہمت نہیں۔ کلامِ حسرت کے مُحاسن درج ذیل ہیں۔

۱۔ رنگِ تغزل

حسرت کے تغزل کی شان سب سے جُدا ہے۔ ان کے تغزل میں بلا کا نِکھار ہے، سُتھرا پن ہے، حلاوت ہے، شیرینی ہے، ایسی حلاوت اور شیرینی جو بہت کم شعراء کو نصیب ہوتی ہے۔ اِن کی شاعری میں سیدھے سادھے انسان کے دِل کا معاملہ پیش کیا گیا ہے۔ کوئی خیالی محبوب یا دوست نہیں ہے۔ جو بھی ہے وہ اس دنیا کی جیتی جاگتی مخلوق ہے جس کے سراپے، حُسن وحیا اور عفت وعصمت کو حسرت نے مجسمہ سے تشبیہہ دی ہے اور کلامِ حسرت کا رنگِ تغزل ہی اہم خوبی ہے جو جذبات کی شدت انگیزی کو ظاہر کرتا ہے۔

آئینہ میں وہ دکھ رہے تھے بہارِ حسن — آیا میرا خیال تو شرما کے رہ گئے
چُپکے چُپکے رات دن آنسو بہانا یاد ہے — ہم کو اب تک عاشقی کا وہ زمانہ یاد ہے
دوپہر کی دھوپ میں میرے بُلانے پر — وہ ترا کوٹھے پہ ننگے پاؤں آنا یاد ہے

۲۔ جمالیاتی عُنصر

مولانا حسرت گو مادہ مزاج اور سادی طبیعت ہیں لیکن ان کا کلام بے پناہ جمالیاتی حُسن رکھتا ہے۔ حسرت جمالیاتی شاعری کا بہترین ذوق رکھتے ہیں۔ ان کے ذوقِ جمال اور حُسن پرستی میں ان کی معصومیت کو بڑا دخل ہے۔ وہ اپنے جذبات کے اظہار میں بڑے بے باک اور عُریاں ہیں۔ لیکن ان کی معصومی فطرت ان کے وقارِ شاعری اور علمیانہ خیالات کا اِس طرح احاطہ کر لیتی ہیں کہ پاکیزگی اور معصومیت اُن پر نازاں ہو۔

اللہ رے جسمِ یار کی خوبی کہ خود بخود — رنگینیوں میں ڈوب گیا پیرہن تمام
روشن جمالِ یار سے ہے پیرہن تمام — دہکا ہوا ہے آتشِ گُل سے چمن تمام

۳۔ طبیعت کی طُرفگی

حسرت نے ہمارے لیے دو کتابیں چھوڑی ہیں ایک اپنا دیوان، دوسرے اپنی مثالی زندگی۔ دونوں اہم ہیں لیکن دونوں علیحدہ علیحدہ ہیں اور دونوں میں خاصہ فاصلہ ہے۔ اس فاصلہ نے ان کی شخصیت دونیم کر دی ہے۔ عقائد میں قدارت، سیاست میں شدت، ایک طرف قید وبند کی تکالیف اور دوسرے طرف غزل سرائی، حسرت نے اپنے اس تضاد کی طرف خوش اشارہ کیا ہے۔

ہے مشقِ سخن جاری، چکّی کی مشقت بھی
اِک طرفہ تماشا ہے، حسرت کی طبیعت کا

ڈاکٹر یوسف حسین خان کا کہنا ہے کہ حسرت کی طبیعت کی طرفگی میں فنی تخلیق کی صلاحیتیں پوشیدہ تھیں۔ کبھی یہ محبت اور حسنِ آرزو کا رنگ اختیار کرتی ہیں اور کبھی آزادی کا رُوپ دھارتی ہیں۔

۴۔ وقارِ حُسن

حسرت نے غزل میں عاشقانہ جذبات کا اظہار بڑے باوقار پیرائے میں کیا ہے۔ کیونکہ وہ حسن وعشق دونوں کی محبت کے قائل ہیں ان کو رُسوائی گوارا نہیں ہے اور نہ وہ خود ذلیل ہوتے ہیں اور نہ ہی محبوب یا اس کے حُسن کو ذلیل کرتے ہیں۔ اور عشق میں پاکبازی کا دامن نہیں چھوڑتے۔

دیکھنا بھی تو انہیں دور سے دیکھا کرنا
شیوہ عشق نہیں حُسن کو رسوا کرنا

گرویدہ اہلِ شوق، جو حُسنِ بُتاں کے ہیں

M.HARIS BASIM

شاید سب نشاں اسی بے نشاں کے ہیں

۵۔ سادگی وسلاست

سادگی وسلاست اور سچائی ہی کلام کی رُوح ہیں حسرت کی زبان بے پناہ سادہ اور سلیس ہے ان کے یہاں فارسی تراکیب بھی پائی جاتی ہیں لیکن ان میں سادگی کی کثرت ہے۔

شِعر دراصل وہی ہے حسرت
سُنتے ہی دل میں جو اُتر جائے

جُرد کا نام جُنوں پڑ گیا جُنوں کا جُرد
جو چاہے آپکا حُسن کرشمہ سازکرے

۶۔ نغمہ موسیقیت

حسرت کی عِشقیہ (رومانوی) شاعری کی سب سے بڑی خوبی نغمہ وموسیقیت ہے۔ترنم ہے جس نے اِن کے اشعار میں جادوئی کیفیت پیدا کردی ہے۔

حُسن بے پروا کو خود بین وخود آراء کر دیا
کیا کیا میں نے کہ اظہارِ تمنا کر دیا

چپکے چپکے رات دن آنسو بہانا یاد ہے
ہم کو اب تک عاشقی کا وہ زمانہ یاد ہے

۷۔ زندگی کی ترجُمانی

حسرت کی غزلیات میں اگرچہ شررِ عشق بہت ہے اور یہی عشق کی چنگاریاں بغاوت کے شعلے، تصوف کی آنچ اور ظرافت کے پُھول ہیں۔لیکن ان کی شاعری بنیادی طور پر حسن وعشق کی شاعری ہے۔ڈاکٹر سید عبداللہ کہتے ہیں کہ "حسرت نئے زمانے کا آدمی ہوکر بھی پرانی شاعری کا وارث ہے اور پرانی شاعری کا وارث ہوکر بھی نئے دور کا آدمی معلوم ہوتا ہے۔اس کی باتیں ماضی کے مدھم تجربات کا خیالی بیان نہیں معلوم ہوتیں۔حسرت اپنے دور کے احساسات اور رویوں کے بہترین عکّاس اور ترجمان معلوم ہوتے ہیں۔

اِک خلش ہوتی ہے محسوس رگِ جاں کے قریب
آن پہنچے ہیں مگر منزلِ جاناں کے قریب

۸۔ سیاسی رنگ

حسرت کی شاعری میں جہاں رنگِ تغزل بے پناہ ہے وہیں ان کی شاعری میں سیاسی رنگ بھی جھلکتا ہے۔وہ اپنے زمانے اور سیاست کے نشیب وفراز سے اچھی طرح واقف تھے اور اسے اپنی شاعری میں بھی پیش کر چکے ہیں۔

نہ سرمایہ داروں کی نُخوت رہے گی — نہ حُکّام کا جورِ بے جا رہے گا
زمانہ وہ جلد آنے والا ہے جس میں — کسی کا نہ محنت پہ دعویٰ رہے گا

۹۔ رنگِ حسرت

اِس میں شک نہیں کہ حسرت نے قدیم شاعروں کا وسیع مطالعہ کیا اور اس سے اپنا منفرد لہجہ بنایا۔مختلف شاعروں سے فیض حاصل کرنے پر وہ خود فخریہ کہتے ہیں؛

غالبؔ و مصحفیؔ و میرؔ و نسیمؔ و مومنؔ

M.HARIS BASIM

طبعِ حسرتؔ نے اُٹھایا ہے ہر استاد سے فیض

بہت سے اُستادوں سے فیض اُٹھانے کا مطلب یہ نہیں کہ ان کا کوئی منفرد انداز نہیں۔ ان کے انفرادی رنگ کے بارے میں ڈاکٹر یوسف حسین کہتے ہیں کہ؛

" لکھنوی زبان ومحاورہ اور دہلوی اسلوب کی آمیزش وترکیب سے حسرت کے رنگ کی تخلیق ہوئی ہے۔"

۱۰۔ دھیما اور شائستہ لہجہ

حسرت کے لہجے میں جھنجھلاہٹ اور تلخی بالکل نہیں ہے بلکہ اِن کی شکایت کا لہجہ بھی بڑا محبت آمیز، سحر انگیز، دھیما اور خوشگوار ہوتا ہے۔ ان کی شکایت میں بھی معصومیت اور سُپردگی ہوتی ہے۔

آ کے بیٹھیں تو سہی، آپ میرے پاس بھی — کہ میں فرصت میں حدیثِ دل دیوانہ کہوں
ہم شکوہ فلک ہی کریں گے حضورِ دوست — ظاہر نہ ہونے دیں گے وہاں بھی قصورِ دوست

حسرت بے باک اور نڈر شاعر ہیں چاہے رنگِ تغزل ہو یا رنگِ سیاست بے باک شاعری کرتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ جذبے کے اسی خلوص کا نام، اور فکر کی اسی صداقت کا نام **حسرت موہانی** ہے۔

حسرت کی شاعری میں خوب سے خوب تر کی تلاش وجستجو ہے اور اسی جستجو کی بدولت ان کی عشقیہ شاعری میں تخیل کی بُلند پروازی ہے۔ حسرت کی شاعری میں ہمیں عشق کا بڑا فطری رویہ اور حقیقی رویہ ملتا ہے جس میں ان کے تخلیقی جوہر کو بڑا دخل ہے۔ جس نے حسرت کے جمالیاتی شعور کو اپنے محبوب کے حسن کو آسمانی وصف کے ساتھ ہم آہنگ کر دیا ہے جس سے ان کی شاعری میں قدم قدم پر رنگ وبُو کا احساس ہوتا ہے۔

اِسی احساس اور جمالیاتی شعور کی وجہ سے حسرت کی غزل میں نرمی، لطافت اور شریفانہ عشقیہ جذبات کا اظہار ملتا ہے۔

نگاہِ یار جسے آشنائے راز کرے
وہ کیوں نہ طوبیٰ قسمت پہ اپنی ناز کرے

نہیں آتی تو یاد ان کی مہینوں تک نہیں آتی
مگر جب یاد آتے ہیں تو اکثر یاد آتے ہیں

مضامین کی شگفتگی، لطافت اور ندرت کی وجہ سے حسرت کی شاعری عِشق کی داستان نہیں معلوم ہوتی بلکہ ایسا لگتا ہے جیسے ان تصورات، خیالات اور تجربات کا ہماری زندگی کے حسین لمحوں اور واقعات سے گہرا ربط ہے جو ہم سب کا سرمایہ حیات ہیں۔

حسرت کی عشقیہ شاعری اور معاملاتی شاعری سے یہ حقیقت سامنے آجاتی ہے کہ حسرت کی شاعری سچے جذبات کی شاعری ہے۔ جس میں انسانی زندگی کے ولولے، شوق، جذبات وکیفیات ہم آغوش ہیں۔ اسی وجہ سے حسرت کی غزل میں غنائیت، شگفتگی، عشق کی تازہ کاریاں، حُسن کی جلوہ ریزیاں، بے ساختگی کیف اور سرور پایا جاتا ہے۔ جس میں تحیّر بھی ہے اور معصومیت بھی۔ جس میں نشاطیہ کیفیات بھی ہیں اور حسرت کے لہجہ کا بانکپن بھی۔ شخصیت کے مکمل ہونے اور اپنی عظمتوں کا احساس بھی۔ یہی وہ خصوصیات ہیں جن کی وجہ سے حسرت کی شاعری میں زندگی اپنے تمام تر جمال وجمال کے ساتھ مِلتی ہے۔ جس میں نغمگی بھی ہے اور گداز بھی۔ اور میرا اپنا خیال ہے کہ مومن کے کلام سے تغزل کا مفہوم تو ضرور سمجھ میں آجاتا ہے لیکن اگر تغزل کی شان دیکھنا ہو تو حسرت کی غزل کا ضرور مطالعہ کر لیا جائے جس میں رنگ، خوشبو، کیفیات اور جذبات آغوش در آغوش نظر آتے ہیں۔

کٹ گئی احتیاتِ عِشق میں عُمر
ہم سے اظہارِ مُدّعا نہ ہوا

M.HARIS BASIM

حصۂ مضامین

☆ ''محنت وجدوجہد'' کامیابی کیلئے شرط ہے۔

☆ محنت زندہ قوموں کی ہے عظمت کی پہچان۔

☆ ہمت کرے انساں تو کیا ہو نہیں سکتا۔

☆ محض آرزوؤں سے قوموں کی تقدیریں نہیں بدلتیں۔

☆ حرکت میں برکت ہے۔

یہ کائنات اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق کے لئے بنائی ہے۔اُس کی مخلوق میں انسان،فرشتے،جنات،حیوان،شجروحجر سب شامل ہیں۔انسان کیونکہ اشرف المخلوقات ہے اور درحقیقت یہ کائنات بنائی ہی اس کے لئے گئی ہے اس لئے اللہ تعالیٰ نے انسان کو وہ قوتیں اور وہ صلاحیتیں عطا فرمائی ہیں کہ جن کو استعمال کر کے وہ اس کائنات کے تمام ظاہری اور پوشیدہ خزانوں سے استفادہ حاصل کرسکتا ہے۔

محنت بھی ایک صلاحیت ہے۔ایک وقت ہے۔ایسی بے بہا اور لازوال صلاحیت وقوت کہ جس کے مسلسل استعمال سے انسان نہ صرف زمین اور سمندر کی تہہ میں پہنچ کر اس کی گہرائیوں سے قیمتی چیزیں حاصل کرسکتا ہے بلکہ فضاؤں کا سینہ چیر کر سیاروں میں اپنی کامیابی وکامرانی کے جھنڈے گاڑ سکتا ہے۔

؎ وہ کون سا عقیدہ ہے جو وا ہو نہیں سکتا
ہمت کرے انساں تو کیا ہو نہیں سکتا

محنت دونوں سمت میں کی جاسکتی ہے۔یہ خیر کی صلاحیت بھی ہے اور شر کی بھی۔جو لوگ نیک' اچھے' بھلائی اور خیر کے کاموں کے لئے محنت،جدوجہد کرتے ہیں وہ دنیا و آخرت دونوں میں سُرخرو ہوتے ہیں اور جو برے' غیر اخلاق' غیر قانونی اور شر کے کام کرتے ہیں وہ وقتی اور عارضی فائدہ تو اٹھاتے ہیں لیکن انجام بہرحال انکا برا ہی ہوتا ہے۔

؎ عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

ایک شخص اگر اپنی انفرادی زندگی کو سنوارنے اور سدھارنے کیلئے جدوجہد کرتا ہے تو اس کی محنت کے ثمرات اس کی ذاتی زندگی تک محدود رہتے ہیں یا پھر زیادہ سے زیادہ اس سے متعلقہ افراد اس کی محنت وجدوجہد سے مستفید ہوتے ہیں۔لیکن جب اس محنت وجدوجہد کا دائرہ اجتماعی یعنی معاشرتی زندگی تک بڑھا دیا جائے تو یہ نہ صرف انسانیت کی خدمت ہوگی بلکہ قوم اور ملک دونوں کی ترقی کا باعث ہوگی۔قوم اور ملک ترقی ہی اس وقت کرتے ہیں جب سب مل کر کوشش،محنت اور جدوجہد کریں۔

؎ خدا نہ آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت بدلنے کا

محنت وجدوجہد ہی کامیابی کا راستہ ہے جس سمت میں اور جس میدان میں ہم محنت وجدوجہد کریں گے خواہ وہ سماجی' معاشی' معاشرتی' اقتصادی' اخلاقی' قانونی' تعلیمی' مذہبی اور سیاسی ہی کیوں نہ ہو۔ہم اس میں مقبولیت' شہرت اور ناموری پیدا کرسکتے ہیں۔محنت سے گھبرانا نہیں چاہئے۔محنت' محنت اور انتھک محنت ہی زندگی میں کامیابی وکامرانی کی ضمانت ہے۔جو محنت وجدوجہد سے جی چراتے اور کتراتے ہیں وہ سُن لیں:

؎ نامی کوئی بغیر مشقت نہیں ہوا
سو بار جب عقیق کٹا' تب نگیں ہوا

یوں تو ''جسمانی محنت'' اور ''ذہنی محنت'' دونوں اپنی اپنی جگہ کارآمد ہیں۔دنیا میں ہزارہا لوگ ایسے ہیں جو صرف جسمانی محنت سے کام لیتے ہیں یا پھر ذہنی محنت سے۔لیکن جب ان دونوں صلاحیتوں اور قوتوں سے حسنِ خوبی کے ساتھ کام لیا جائے تو انسان ترقی کے کمال درجے پر پہنچ جاتا ہے۔

''محض آرزوؤں سے قوموں کی تقدیریں نہیں بدلتیں''۔ کسی قوم کے افراد خواہ کتنی ہی اپنی قوم سے محبت کرتے ہوں، اس کی ترقی کے خواہاں ہوں، اس کا بھلا چاہتے ہوں، دل سے ان کی خواہش وتمنا ہو کہ ان کی قوم برائیوں اور انتشار کے شکار نہ ہوں اور ان کی قوم دن دوگنی اور رات چوگنی ترقی کرے لیکن یہ ممکن ہی نہیں ہے تاوقتیکہ کہ وہ اپنی ذہنی اور جسمانی صلاحیتوں کو استعمال نہ کریں۔ ان کو اپنی خواہش کی تکمیل کے لئے باقاعدہ پلاننگ کرنا ہوگی اور اس کے مطابق عملِ پیہم اور مسلسل محنت و جدوجہد سے کام لینا ہوگا۔

محنت سے جو پیار کرے وہ سب سے بڑا انسان
محنت زندہ قوموں کی ہے عظمت کی پہچان

انسان کی ضروریات کبھی ختم نہیں ہوتیں۔ بدلتے ہوئے حالات اور تبدیل ہوتے ہوئے ماحول میں نئی نئی ضروریات جنم لیتی ہیں۔ یہ انسان ہے جس نے اپنی محنت اور جدوجہد سے علم سائنس پر اتنا قابو پالیا ہے کہ وہ نت نئی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے طرح طرح کی ایجادات کرتا رہتا ہے۔ ذرا غور کیجئے ان ایجادات کے پیچھے محنت اور جدوجہد ہی کارفرما ہے۔ ''ضروریات کو ایجاد کی ماں'' کہا ہی اس لئے جاتا ہے جب تک کسی چیز کی ضرورت نہ ہو، انسان بے فکر رہتا ہے۔ لیکن جیسے ہی ضرورت پڑتی ہے اور بڑھتی ہے انسان کوئی نہ کوئی اس کا حل نکالنے کے لئے کوشش کرتا ہے محنت اور جدوجہد کرتا ہے اور یہ کوشش وسعی اس وقت تک جاری رہتی ہے جب تک کہ کوئی حل نہ نکل آئے۔

بزرگ کہا کرتے ہیں ''سفر وسیلہ ظفر'' یا ''حرکت میں برکت ہے'' اس سے مراد محنت و جدوجہد ہے۔ آدمی کو ترقی' کامیابی و کامرانی کیلئے ہر لمحہ مسلسل جدوجہد کرنا چاہئے۔ یہ نہیں کہ ایک کامیابی حاصل ہوگئی تو ہاتھ پر ہات رکھ کر بیٹھ گئے۔ ایک کامیابی کے بعد دوسری اور دوسری کے بعد تیسری کے لئے کوشاں رہنا چاہئے۔ بقول اقبال:

تو وہ نور دشوق ہے منزل کہ کر قبول
لیلیٰ بھی ہم نشیں ہو تو محمل نہ کر قبول

☆.....☆.....☆

☆ ''اتحاد و اتفاق'' قوت کا سرچشمہ ہے۔
☆ پیوستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ۔
☆ ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لئے۔
☆ قوم مذہب سے ہے' مذہب جو نہیں' تم بھی نہیں۔
☆ قومی اتحاد۔
☆ اتحاد کی برکتیں۔

اتحاد و اتفاق حقیقت میں بہت بڑی قوت کا نام ہے۔ جس خاندان' قبیلے' قوم یا ملک کو یہ قوت حاصل ہو وہ کبھی زوال پذیر نہیں ہوسکتا۔ آپس میں اتحاد و اتفاق کی وجہ سے ہمدردی' محبت' پیار بھی پیدا ہوتا ہے اور ہمت وحوصلہ بھی بڑھتا ہے۔

افراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر
ہر فرد ہے ملت کے مقصد کا ستارہ

اس حقیقت سے کون انکار کرسکتا ہے کہ جب تک پھل' پھول' پتے' شجر سے پیوستہ رہتے ہیں خوب پھلتے پھولتے ہیں۔ سرسبز و شاداب رہتے ہیں لیکن جب وہ درخت

M.HARIS BASIM

سے جدا ہو جاتے ہیں تو سڑ گل جاتے ہیں ان کے لیئے موسمِ بازار سے لطف اندوز ہو ممکن نہیں رہتا۔ یہی حال انسان کا ہے بحیثیت قوم، قبیلہ، برادری اگر ان میں فکری اور عملی اتحاد اور یک جہتی ہے تو وہ ترقی کے راستے پر گامزن رہیں گے ورنہ پستی اور تنزل انکا مقدر ہو گی۔ اسی لئے شاعر نے کہا:

؎ پیوستہ رہ شجر سے امیدِ بہار رکھ

اور یہی بات اقبالؔ نے یوں بھی کہی ہے کہ:

؎ فرد قائم ربطِ ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

اتحاد و اتفاق پیدا کرنے میں مذہب انتہائی اہم اور کلیدی کردار ادا کرتا ہے۔ اس کی بہترین مثال مسلمان قوم ہے۔ جب مکہ سے نکلے تھے تو یہ مٹھی بھر مسلمان تھے۔۔۔۔۔ لیکن جب ایک خاص مقصد کے لئے ان میں اتحاد و اتفاق پیدا ہوا تو دیکھتے ہی دیکھتے معلوم دنیا پر چھا گئے۔ یہ مذہب ہی ہے جو مختلف قوم، رنگ، نسل اور طبقوں سے تعلق رکھنے والوں کو یکجا کرتا ہے۔

؎ قوم مذہب سے ہے، مذہب جو نہیں، تم بھی نہیں
جذب باہم جو نہیں، محفل انجم بھی نہیں

تاریخ شاہد ہے کہ مسلمان جب تک اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کی رسی کو مضبوطے سے تھامے رہے اور احکامات الٰہی کے مطابق زندگی گزارتے رہے تو وہ مسلسل ترقی کرتے رہے لیکن جب انہوں نے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے احکامات سے روگردانی کی، انکی بندی اور اطاعت سے منہ موڑا انکا شیرازہ بکھر گیا۔ وہ چھوٹے چھوٹے گروہ اور فرقوں میں تقسیم ہو گئے۔ زبانوں، ذاتوں اور علاقوں کی بنیاد پر بٹ کر کمزور ہو گئے۔ اسی لئے اقبالؔ نے کہا:

؎ فرقہ بندی ہے کہیں اور کہیں ذاتیں ہیں
کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں

مسلمان قوم اگر حقیقت میں فرق کرنا چاہتی ہے تو پوری دنیا کے مسلمانوں کو دوسروں کا منہ تکنے اور ان کے راستے پر چلنے کی ضرورت نہیں۔ ہماری قومی ترقی کا راز مذہب کی پیروی میں پوشیدہ ہے۔ ہم اپنے آباء و اجداد اور بزرگوں کے نقشِ قدم پر چل کر اپنی کھوئی ہوئی عزت و عظمت اور شان و شوکت حاصل کر سکتے ہیں۔ بشرطیکہ:

؎ ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لئے
نیل کے ساحل سے لے کر تابہ خاک کاشغر

اسلامی بھائی چارے اور اخوت کا درس دیتا ہے۔ ہمیں اپنے تمام چھوٹے بڑے اختلافات، لڑائی جھگڑے بھلا کر ایک دوسرے کے ساتھ محبت، ہمدردی اور جذبۂ ایثار کے ساتھ پیش آنا چاہیئے۔ اپنے دل و دماغ اپنے وطن سے محبت اور اہل وطن کی عزت و تعظیم ہونا چاہیئے۔

؎ منفعت ایک ہے اس قوم کی، نقصان بھی ایک
ایک ہی سب کا نبی ﷺ، دین بھی، ایمان بھی ایک
حرم پاک بھی، اللہ بھی، قرآن بھی ایک
کچھ بڑی بات تھی ہوتے جو مسلمان بھی ایک

کاش پوری دنیا کے مسلمانوں کو اپنی گمشدہ عظمت کا احساس ہو جائے اور وہ ایک بار پھر سے ''نیک اور ایک'' ہو جائیں اور اس سطحِ زمین پر ایسی لازوال قوت بن کر ابھریں کہ ہم فخریہ کہہ سکیں:

؎ باطل سے دبنے والے اے آسماں نہیں ہم
سو بار کر چکا ہے تو امتحان ہمارا

☆.....☆.....☆

M.HARIS BASIM

☆ وقت کی اہمیت۔

☆ وقت کی قدر یا وقت کی پابندی۔

☆ طلباء کی زندگی میں وقت کی اہمیت۔

وقت ایک بہت ہی اہم اور قیمتی دولت ہے۔ جو لوگ وقت کی قدر و قیمت دولت ہے۔ جو لوگ وقت کی قدر و قیمت کو سمجھتے اور جانتے ہیں وہ وقت کے تقاضوں کے مطابق اقدامات کرتے ہیں اور وقت سے بھرپور فائدہ اٹھاتے ہیں اور جو لوگ نادان و ناسمجھ ہیں۔ وقت کو معمولی بات سمجھ کر نظر انداز کرتے ہیں۔ وہ ہمیشہ نقصان میں رہتے ہیں اور وقت ضائع کرنے کے بعد کفِ افسوس مَلتے ہیں۔

کھو کے نادان اسے کوئی پاتا نہیں
گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں

عموماً وقت کو بہت ظالم کہا جاتا ہے کیونکہ گردشِ زمانہ کسی کا انتظار نہیں کرتی۔ وقت ہر لمحہ اور ہر پل گزرتا رہتا ہے۔ وقت کی گردش کے نتیجے میں چیزیں بنتی اور بگڑتی رہتی ہیں لیکن زمانے کی رفتار پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔

محمد حسین آزاد نے اپنی کتاب میں مختلف چیزوں کو انسان کی شکل میں بتایا ہے کہ اگر عشق، شہرت، قانون، بدنامی انسان کی شکل میں ہوتی تو کیسی ہوتی۔ اِسی طرح وقت کا نقشہ یوں کھینچا ہے کہ یہ ایک بہت ہی لحیم شحیم، انتہائی قوی، مضبوط اور دیوہیکل شخص ہے۔ اس کے دو پَر ہیں، آگے کی طرف چوٹی ہے اور ہاتھ میں درانتی ہے۔ یہ ہر لمحہ اور ہر پل آگے کی طرف بڑھتا رہتا ہے۔ کیونکہ انتہائی طاقتور ہے اس کو کوئی روک نہیں سکتا۔ یہ ظالم اتنا ہے کہ جو بھی اس کے سامنے آتا ہے ان کی عمریں کاٹتا ہوا آگے بڑھتا چلا جاتا ہے یہ نہیں دیکھتا کہ یہ عورت ہے، مرد ہے، بوڑھا ہے، بچہ ہے۔ جس وقت ہمیں یہ محسوس ہوتا ہے کہ اتنی جلدی وقت گزر گیا اس وقت یہ پروں سے اڑتا ہوتا ہے اور جس وقت یہ محسوس ہوتا ہے کہ وقت گزر ہی نہیں رہا ہے تو آہستہ آہستہ چلتا ہوتا ہے۔ جو دانا اور عقلمند ہیں وہ جانتے ہیں کہ وقت کی چوٹی آگے ہوتی ہے اس لئے وہ اس کو آگے سے قابو کر لیتے ہیں لیکن جو بے وقوف اور نادان ہیں ہیں جب وقت گزر جاتا ہے تو پکڑنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن وقت کی چوٹی پیچھے نہیں ہوتی اس لیے وہ اس کو پکڑ نہیں پاتے اور افسوس کرتے رہ جاتے ہیں۔

جو وقت گزر گیا اکارت
افسوس خزانہ ہوا غارت

عقلمندی کا تقاضہ یہ ہے کہ زندگی کے تمام معاملات اپنے صحیح اور مناسب وقت پر انجام دینا چاہئے۔ جو لوگ تساہل اور کاہلی سے کام نہیں لیتے اور ہر کام اپنے وقت پر کرتے ہیں وہ ہمیشہ کامیاب و کامران ہوتے ہیں۔ وقت کو ضائع کرنے والا نہ کبھی کامیاب ہوتا ہے اور نہ ہی کوئی مقام حاصل کرتا ہے۔

جو لوگ بچپن سے ہی وقت پر تمام کام کرنے کی عادت ڈالتے ہیں وہ بڑھاپے میں بھی اطمینان و سکون سے وقت گزارتے ہیں۔ وقت کی قدر نہ کرنے والے جوں جوں عمر بڑھتی جاتی ہے، ضعیفی اور کمزوری میں اضافہ ہوتا جاتا ہے لہٰذا اپنے جمع کردہ امور کے اعتبار سے خود ہی پریشان رہتے ہیں۔ وقت پر کام کرنے والا انسان مفید اور سودمند کاموں میں مشغول و مصروف رہتا ہے جبکہ بے کار آدمی کے دماغ کو شیطان کا گھر کہا جاتا ہے۔ جب بھی کوئی بیکار بیٹھے یا فضول اور بے معنی باتوں اور خیالات میں اس کا وقت گزرے گا۔

غیرت یوسف ہے یہ وقت عزیز
میرؔ اس کو رائیگاں کھوتا ہے کیا

ایک طالبعلم کے روشن مستقبل کا دارومدار اس کے زمانہ طلب علمی پر ہے۔ یہ زمانہ طالب علم کی عمر کا انتہائی قیمتی اور اہم ترین حصہ ہے۔ اگر طلب علم نے اس زمانے میں وقت کی قدر و قیمت اور اہمیت کو سمجھ لیا اور وقت سے پوری طرح فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنی پوری توجہ حصولِ علم و فنون پر دی اور اس کی صحیح بنیادوں پر تعلیم و تربیت ہوگئی تو اس کا مستقبل بن جائے گا۔ پوری زندگی چین و سکون سے گزرے گی۔ اس کے برعکس وہ طالب علم نادانی اور ناسمجھی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ ماں باپ کی نصیحتوں پر کان نہیں دھرتے، استاد کی بات نہیں سنتے، کلاس میں باتیں اور ہنسی مذاق کرنے میں وقت گزارتے ہیں، گھر پر دکھاوا کرنے کے لئے ٹیبل پر کتابیں پھیلائے گھنٹوں بیٹھے

M.HARIS BASIM

رہتے ہیں اور سارا وقت الٹی سیدھی لائنیں کھینچنے، بے مقصد الفاظ اور جملے لکھنے اور کارٹوں بنانے میں گزارتے ہیں۔ ایسے طالب علم اپنے آپ کو دھوکا دیتے ہیں۔ چند سال تو اس بے راہ روی میں ہنسی خوشی گزر جاتے ہیں لیکن مستقبل تاریک ہو جاتا ہے اور اس کا احساس اس وقت ہوتا ہے جب بدلتے ہوئے ناسازگار حالات میں ذمہ داریاں بڑھتی ہی چلی جاتی ہیں۔ پوری زندگی بے چینی و بے قراری کی نظر ہو جاتی ہے۔ پھر وہ پچھتاتا اور افسوس کرتا ہے لیکن ملامت کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ:

''اب پچھتائے کیا ہوت جب چڑیاں چگ گئیں کھیت''

طالب علموں کو چاہئے کہ نظر اس بات پر رکھیں کہ ان کو مستقبل میں وقت کا غلام بن کر نہیں رہنا ہے بلکہ وقت کو اپنے تابع کرنا ہے۔ بقول اکبر الہ آبادی:

لوگ کہتے ہیں بدلتا ہے زمانہ سب کو
مرد وہ ہیں جو زمانے کو بدل دیتے ہیں

☆.....☆.....☆

☆ کتاب بہترین دوست ہے۔
☆ طلباء کی زندگی میں کتب بینی کی اہمیت۔
☆ کوئی رفیق نہیں کتاب بہتر۔
☆ میرا پسندیدہ مشغلہ۔

بچپن میں بعض لوگوں کو دیکھا کرتا تھا کہ ہر وقت منہ کو کتاب لگائے رہتے ہیں۔ جب دیکھو کتاب ان کے ہاتھ میں ہے۔ جہاں موقع ملا تنہائی میں سفر میں، دن میں رات میں، ہر وقت، ہر جگہ بس کتاب کھولی اور مطالعہ شروع کر دیا۔ میں سوچتا تھا کہ مجھ سے کورس کی کتابیں نہیں پڑھی جاتیں یہ فالتو کتابیں پڑھتے رہتے ہیں۔ کاش! یہی ہماری جگہ امتحان دے دیا کریں۔ کتنا مزہ آئے!!! مطالعہ کی بیماری ہماری خاندانی بیماری ہے یہ ہمارے ابا جان سے ہماری بہن صاحبہ کو بھی لگی تھی۔ اسکول کالج سے آئیں کتاب لی اور پڑ گئیں۔ گھر کا کام کاج کیا۔ کتاب اٹھائی شروع ہو گئیں۔ ہم اپنی بہن کو پیار سے ''باجی کتابی'' کہتے تھے۔ ایک دن ہمیں تعجب ہوا وہ کتاب پڑھتی جا رہی ہیں اور ہانڈی پکاتی جا رہی ہیں ہم نے طنز کرتے ہوئے کہا۔۔۔۔۔ باجی کتابی کیا ہانڈی میں بھی کتابیں ہی پکا رہی ہیں؟؟؟؟ ہنسے لگیں نہیں پگلے۔۔۔ کتاب کی مدد سے بہترین ڈش تیار کر رہی ہوں۔ کھاؤ گے تو انگلیاں چاٹتے رہ جاؤ گے۔ ہم چھوٹے تھے سمجھ میں ہی نہیں آیا۔۔۔ کتاب کا کیا واسطہ ہانڈی سے بھلا؟؟؟ ہاں البتہ ڈش اتنی مزیدار تھی کہ آج تک اس کا مزہ محسوس کرتے ہیں۔ ہمیں تعجب ہوا۔ کتابوں میں کیا ہوتا ہے۔ ایک دن باجی کتابی کالج سے واپسی پر ہمارے لیے کوئی چھوٹی چھوٹی مگر معیاری کتابیں جن میں دلچسپ کہانی، قصے، افسانے، لطیفے اور پہیلیاں وغیرہ تھیں لے کر آئیں۔ ہائے کیا ظلم کیا باجی کتابی نے کہ اس دن سے ہمیں کتابیں پڑھنے کا ایسا چسکا لگا کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ کتابوں سے ہماری دوستی مضبوط سے مضبوط تر ہوتی جا رہی ہے اور اب تو کتاب پڑھنا ہمارا پسندیدہ مشغلہ بن گیا ہے۔ بلکہ بیماری کمزوری ہے کہ نئی کتاب کا نام سنا اور ہم بازار یا لائبریری کی طرف دوڑے۔

حقیقت میں کتاب ہماری سچی اور مخلص دوست اور ساتھی ہے۔ جب اٹھائیے دل بہلانے کو بلا عذر حاضر ہے۔ ہاں کتاب کے انتخاب میں پوری طرح سے احتیاط کرنا چاہئے کیونکہ کم عمری میں ہر بات دل پر لکھ جاتی ہے۔ ان میں سے بعض باتیں ایسی ہوتی ہیں کہ تاحیات انکو دل و دماغ سے مٹایا نہیں جا سکتا۔ جس طرح سے اچھے عادت و اخلاق والا دوست اپنے دوست پر اثر انداز ہوتا ہے اس کو برائیوں سے نکالتا ہے اور اپنی ذاتی حیثیت سے متاثر کرتا ہے۔ اسی طرح برے چال چلن اور خراب عادات والا دوست خود بھی غلط راستوں پر چل کر تباہ و برباد ہوتا ہے اور دوست کو بھی تاریک گڑھے میں دھکیل دیتا ہے۔ بالکل یہی حال کتاب کا ہے۔ اچھی کتاب دل و دماغ اور عادات و اطوار پر اچھا اثر ڈالتی ہے اور بری کتاب میں چال چلن میں کمزور اور طبیعت کو برائی کی طرف راغب کرتی ہیں۔ لہٰذا تفریح اور دل بہلانے کیلئے گھٹیا

W.HARIS BASIM

ناول اور افسانوں کے بجائے ایسی کتابیں پڑھنی چاہئیں جو خیالات و اخلاق پر اچھا اثر ڈالیں۔

کتاب ایک جامِ جہاں نما ہے۔ جو گھر بیٹھے ملک ملک کی سیر کراتی ہے۔ کبھی یہ یورپ کی خوشحالی، ترقی و عروج دکھاتی ہے، تو کبھی ایشیاء کی پریشانی، امریکہ کی دولت اور اپنے ہاں کی مفلسی اور بدنظمی کا نقشہ کھینچتی ہے تو کبھی ماضی کی شان و شوکت اور حاکمین کے کارنامے سناتی ہے۔ مستقبل میں تعمیر و ترقی کے گُر بھی سکھاتی ہے اور کامیابی کے لئے جوش و جذبہ و ولولہ بھی بڑھاتی ہے۔ یہ کتاب ہی ہے جو ہمیں دنیا کے نشیب و فراز سمجھاتی ہے اور خطرات و مشکلات سے آگاہ کرتی ہے۔ یہ ہماری رہنمائی کر کے ہمیں منزلِ مقصود تک پہنچانے میں معاون و مددگار رہوتی ہے۔

کتاب وہ خزانہ ہے جس کے ذریعہ ہمیں ان بزرگوں کے حالات سے آگاہی ہوتی ہے جو ہمارے لئے علم کی لازوال دولت چھوڑ گئے ہیں۔ وہ بزرگ جنہوں نے دنیا کو دیکھا اور آزمایا جنہوں نے دنیا کی تلخیاں جھیلیں، ملکوں ملکوں کی خاک چھانی، گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا، قوانینِ قدرت کا مطالعہ کیا اور برسوں کے غور و خوس، تحقیق و تنقید اور محنت و جدوجہد کے بعد ہمارے لئے اپنے تجربات اور مشاہدات کتابوں کی نذر کر گئے تاکہ ہم ان سے استفادہ کر سکیں۔

کتاب نہ صرف علمی اور سائنسی معلومات کا ذریعہ ہوتی ہیں بلکہ مذہبی رہنمائی بھی کرتی ہے۔ قرآن پاک ایک ایسی کتاب ہے جو مکمل ضابطۂ حیات ہے۔ ہم زندگی کے ہر شعبے میں اس سے رہنمائی حاصل کر سکتے ہیں۔ اس کا مطالعہ دل و ذہن کو وسعت عطا فرماتا ہے انسان کے ذہن کے بند دریچے کھل جاتے ہیں اس کو مقصدِ حیات سے آگہی حاصل ہوتی ہے اور آخرت کا احساس پیدا ہوتے ہی زندگی میں انقلاب برپا ہوتا ہے۔ اس ایک ہی کتاب کا مطالعہ دنیا و آخرت سنوانے کے لئے کافی ہے۔

پس کتاب ایک ایسی دوست ہے کہ اس سے بہتر دوست اور کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔ اگر برے لوگوں کو چھوڑ کر صرف اور صرف اچھے لوگوں سے ہی دوستی کی جائے تب بھی ان کے ساتھ کچھ مفید اور کچھ بے سود وقت گزرے گا۔ لیکن کتاب کے ساتھ گزرنے والا ایک ایک لمحہ کارآمد اور مفید ہوگا۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہمارا انتخاب عمدہ اور بہترین کتابوں کا ہو۔

لو جان بیچ کر بھی جو علم و ہنر ملے
جس سے ملے، جہاں ملے، جس قدر ملے

☆.....☆.....☆

☆ سائنس اور کمپیوٹر

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آ سکتا نہیں — محو حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی

علمِ سائنس ایک تجرباتی علم کہلاتا ہے کیونکہ ان علم نے تجربے خانے میں جنم لیا ہے اور تجربے خانے ہی میں پرورش پائی بلکہ اس کے مزید نشو و نما تجربے خانے ہی میں ہوتی رہے گی۔ اس وقت تک دنیا بھر میں سائنس کی سیکڑوں شاخیں بن چکی ہیں اور لاکھوں آدمی سائنسی تحقیق میں مشغول ہیں۔ وہ سب اس علم کے ذخیرہ میں اضافہ کرتے چلے جا رہے ہیں۔ اس میں تیز رفتار اضافے کا یہ حال ہے کہ ہر دس بارہ سال میں سائنس کی کتابوں کی تعداد تقریباً دوگنی ہو جاتی ہے۔ ایسی ترقی دوسرے علوم میں دیکھنے میں نہیں آتی۔

سائنس اور ٹیکنالوجی کے تعلق سے حاصل ہونے والی ایجادات نے انسانی معاشرے میں ایک انقلاب برپا کر دیا ہے۔ یہ ایک علیحدہ بحث ہے کہ کون سی ایجاد مفید ثابت ہوئی اور کون سی مضر۔ یہاں یہ بات ذہن میں رکھنا چاہئے کہ کوئی بھی ایجاد بذاتِ خود نہ مفید ہوتی ہے اور نہ نقصان دہ۔ یہ خود انسان کے اوپر منحصر ہے اگر وہ اسے مثبت انداز میں استعمال کرے گا تو وہ معاشرے کے لئے مفید ثابت ہوگی اور اگر منفی طور پر استعمال کرے گا تو ظاہر ہے نقصان دہ ہوگی۔ سائنس کی اپنی تیز رفتار ترقی سے بہرحال انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اس دور میں سائنس کی ایک انقلابی اور حیران کن ایجاد کمپیوٹر ہے۔

یوں تو کمپیوٹر کی تاریخ پرانی ہے لیکن بجلی سے چلنے والا کمپیوٹر بیسویں صدی کی ایجاد ہے اس کی ایجاد کئی ماہرین سے منسوب کی جاتی ہے۔ مگر زیادہ اتفاقِ رائے چارلس بابیج (Charles Babbage) کے نام پر ہے۔ دوسرے لوگ اسے ترقی دینے والوں میں سے ہیں، ایجاد کرنے والے نہیں ہیں۔ بیسویں صدی کے ماہرین نے

M.HARIS BASIM

اس دستی مشین کو الیکٹرانک آلہ بنا دیا ہے۔کمپیوٹر کو بجلی سے چلانے کے لئے پہلے ڈائیوڈ ٹیوب (Diode Tube) استعمال کئے جاتے تھے، جب ٹرانسسٹر ایجاد ہو گیا تو ان ٹیوب کی جگہ اسے استعمال کیا جانے لگا۔اب ٹرانسسٹر کی جگہ پر انٹیگریٹڈ سرکٹ (Integrated Circuit) استعمال کیا جاتا ہے۔

کمپیوٹر کے کام کرنے کا اصول یہ ہے کہ کمپیوٹر سے پوچھا جانے والا سوال، جواب حاصل کرنے کی خاطر کمپیوٹر کے ایک حصے اِن پٹ (Input) میں ٹائپ کرنے کے طریقے پر تحریری شکل میں ڈال دیا جاتا ہے۔ان پٹ میں داخل ہونے کے بعد وہ سوال بجلی کی لہروں میں تبدیل ہو جاتا ہے۔لہروں کی صورت میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ لہروں کی صورت میں یہ کمپیوٹر کے پروسیسنگ یونٹ میں پہنچتا ہے۔یہ وہاں سوراخ دار مقناطیسی فیتے کے ذریعہ پہنچتا ہے۔پروسیسنگ یونٹ میں کئی حصے ہوتے ہیں جن میں سے ایک اس کی میموری (Memory) میں سوال سب سے پہلے وہاں پہنچتا ہے۔میموری اسے پروسیسنگ یونٹ کے حسابی یونٹ میں بھیجتا ہے۔وہاں اس کا جواب تیار ہوتا ہے اور پھر وہ کمپیوٹر کے آؤٹ پٹ (Output) پر نمودار ہوتا ہے۔آؤٹ پٹ سے مقناطیسی فیتے پر یا مشین کے اسکرین پر یا کاغذ کے ورقے پر حاصل کیا جا سکتا ہے۔

اب تو کمپیوٹر اتنی ترقی کر گیا ہے کہ اس میں اتنی معلومات اور یادداشتوں کو محفوظ کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے جتنی لاکھوں کتابوں میں محفوظ کی جا سکے۔کمپیوٹر سے انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں آسانیاں اور سہولتیں پیدا ہو گئی ہیں۔دنیا بھر میں ترقی یافتہ ممالک زندگی کے ہر شعبے میں کمپیوٹر کا استعمال بڑھاتے چلے جا رہے ہیں تا کہ ہر قسم کے معاملات و مسائل کو کم وقت میں حل کیا جا سکے۔

ہمارے پاکستانی بھی اعلیٰ درجے کی ذہانت کے مالک ہیں۔قیامِ پاکستان کے بعد سے ہم نے سائنس میں بہت ترقی کی ہے۔حتیٰ کہ ہم نے جوہری توانائی کی قوت بھی حاصل کر لی ہے۔اس طرح ہم نے دنیا کے بہت سے ممالک کو پیچھے چھوڑ دیا ہے۔

اس وقت کمپیوٹر کی اہمیت اور ضرورت سے انکار نہیں کیا جا سکتا اسی لئے سرکاری اور نجی سطح پر کمپیوٹر کی تعلیم کو فروغ دیا جا رہا ہے اور زندگی سے متعلق تمام شعبوں میں کمپیوٹر متعارف کرایا جا رہا ہے۔

☆ میڈیا معاشرے کی تباہی کا باعث ہے۔

غلط۔۔۔بالکل غلط۔۔۔۔یہ برسوں سے ایک طریقہ چلا آ رہا ہے کہ کوئی شخص اپنی غلطی یا جرم خود تسلیم نہیں کرتا۔اگر اپنی غلطی یا خطا کا احساس بھی ہو جائے تو وہ دوسروں کے سر منڈھنے کی کوشش کرتا ہے یا پھر کوئی جواز تلاش کرتا ہے اپنی بے گناہی ثابت کرنے کے لئے۔وہ بہت عظیم لوگ ہوتے ہیں جو خندہ پیشانی اور کھلے دل و دماغ کے ساتھ اپنی غلطی کا اعتراف کرتے ہیں۔

یہی کچھ ''میڈیا'' کے ساتھ ہو رہا ہے۔آنکھ بند کر کے جس کو دیکھو ''میڈیا'' کو برا کہتا ہے نئی نسل کی تباہی و بربادی میں میڈیا کا ہاتھ بتاتا ہے۔عریانیت کے پھیلانے میں میڈیا کو ذمے دار قرار دیتا ہے۔بے راہ روی اور بیہودہ امور کے فروغ کا الزام میڈیا کے سر ہے۔چوری چکاری، قتل و غارت گری، دہشت گردی، لوٹ مار، اسمگلنگ، دہشت گردی حتیٰ کہ چھچھورپن کی تربیت و ترغیب بھی میڈیا کے کھاتے ہی میں ڈالی جاتی ہے۔

''میڈیا'' کیا ہے؟؟؟؟ میڈیا تو ایک بے جان کاغذ ہے جو ہمارے سامنے اخبارات اور رسائل کی شکل میں آتا ہے۔۔۔میڈیا تو بے جان مشینوں کا نام ہے جو ہمارے سامنے ریڈیو، ٹی وی، وی سی آر، ٹیلی فون اور کمپیوٹر وغیرہ کی شکل میں آتی ہیں۔کیا ان بے جان کاغذوں اور مشینوں میں یہ صلاحیت ہے کہ اپنی مرضی سے کچھ کر سکتی ہیں؟؟؟؟ نہیں!!! نہیں۔ہرگز نہیں۔۔۔ان میں جان ڈالنے والے ہم ہی لوگ ہیں۔جو ہم کہتے ہیں۔جو ہم کرتے ہیں۔جو ہم چاہتے ہیں۔یہ بے جان کاغذات اور مشینیں وہی کرتی ہیں تو قصوروار ہم ہوئے کہ میڈیا؟؟؟؟

معاشرہ افراد سے بنتا ہے۔افراد اچھے ہوں گے، معاشرہ اچھا ہوگا۔افراد برے ہوں گے، معاشرہ برا ہوگا۔''میڈیا'' بذاتِ خود نہ اچھا ہے نہ برا۔

میڈیا کو بدنام کرنے میں سب سے بڑا ہاتھ ان افراد کا ہے جو میڈیا سے متعلق بنیادی پالیسیاں بناتے وقت یہ خیال نہیں رکھتے کہ ان کا اثر معاشرے پر مثبت ہوگا یا منفی۔

دوسرے نمبر پر وہ لوگ ذمے دار ہیں جو تکنیکی اور فنی اعتبار سے بھی اور قانونی لحاظ سے بھی میڈیا کے غلط اور بیجا استعمال کو روکنے کا پورا پورا اختیار رکھتے ہیں لیکن نہ وہ فنی صلاحیتیں استعمال کرتے ہیں اور نہ قانون کے مطابق عمل کرتے ہیں۔

M.HARIS BASIM

تیسرے نمبر پر معاشرے کے وہ افراد ذمے دار ہیں جو ذہنی اور نفسیاتی بیمار ہیں' خراب سوسائٹی کے پروردہ ہیں یا پھر روپے پیسے کی ریل پیل نے ان کی آنکھیں بند کر رکھی ہیں۔ یہ لوگ میڈیا سے متعلق کوئی چیز بھی استعمال کرتے ہیں تو فریبی اور گندے ذہن کے ساتھ۔ اگر اخبارات اور رسائل دیکھیں گے تو عریانیت تلاش کریں گے۔ ٹیلی فون استعمال کریں گے تو بکواس اور بیہودہ باتوں اور لوگوں کو تنگ کرنے کے لئے ٹی وی دیکھیں گے تو نفسیاتی تسکین کے لئے دنیا بھر کے چینل تلاش کرتے رہیں گے۔ وی سی آر چلائیں گے تو غلط مقاصد کے لئے۔ کمپیوٹر پر بیٹھیں گے تو تمام اعلیٰ اور صحت مند سرگرمیاں چھوڑ کر نازیبا کاموں کے لئے۔

چوتھے نمبر پر ہمارے باپ دادا اور بزرگ ذمے دار ہیں کہ نوجوان نسل کو بے راہ روی کا شکار ہوتے ہوئے دیکھ کر بھی چشم پوشی کرتے ہیں ان کی صحیح تعلیم و تربیت اور اعلیٰ ظرف کے لئے کوئی بندوبست نہیں کرتے۔

پانچویں نمبر پر ہم خود ذمے دار ہیں معاشرے کی تباہی کے۔ قدرت نے انسان کو عقل و فہم کی دولت دے کر اشرف المخلوقات ہونے کا شرف عطا فرمایا۔ انسان کو ایسی قوتیں، صلاحیتیں، عقل و فہم اور شعور عطا فرمایا کہ وہ اگر غور و فکر کرے تو خیر و شر' اچھے و برے' نیک و بد اور نفع و نقصان میں خود تمیز کر سکتا ہے۔ کسی اور کی مدد کی ضرورت نہیں۔ ہر کام کرنے سے پہلے اگر ہم خود جائزہ لیں کہ یہ کام جو ہم کرنے جا رہے ہیں اچھا یا برا تو ہمارا ضمیر ہمیں خود ہی بتا دے گا۔

انسان کے سامنے کتنی راہیں کھلتی ہیں۔ لیکن ان میں کون سی اچھی ہیں کون سی بری یہ انتخاب کرنا انسان کا فریضہ ہے اور اس فریضے کو عمدہ اور بہتر طریقے سے انجام اسی وقت دیا جا سکتا ہے جب ہم خود عقل و شعور سے کام لیں۔

حقیقت یہ ہے کہ میڈیا سے متعلق تمام ایجادات حیرت انگیز انقلاب لانے کا سبب بنی ہیں۔ ایجاد کوئی بھی ہو اس کا اچھا یا برا ہونا اس کے استعمال کی نوعیت پر موقوف ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ''میڈیا'' کو مثبت و مفید بنائیں نا کہ مضر۔ تاکہ میڈیا ہمارے معاشرے میں انسان کا معاون و مددگار بن کر ابھرے۔

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

☆.....☆.....☆

☆ ابلاغِ عامہ

☆ میڈیا کا معاشرے میں کردار

یوں تو میڈیا سے متعلق ہر ایجاد اخبارات' رسائل' ریڈیو' ٹی وی' وی سی آر' فلم' کمپیوٹر' ٹیلی فون' وائرلیس اور فیکس وغیرہ وغیرہ سب کی سب ہمارے لئے انتہائی مفید اور اہم ہیں۔ ان کا جدید ترین تقاضوں سے ہم آہنگ ہونے پر ہی ہماری ترقی کا دارومدار ہے۔ لیکن ان کا غلط استعمال بھی ان کے مفید ہونے سے زیادہ مضر اور نقصان دہ ہے۔ اس میڈیا نے پوری دنیا کو سمیٹ کر ایک گھر بنا دیا ہے۔ جس طرح اہلِ خانہ گھر کے گوشے گوشے سے واقف ہوتے ہیں اور جانتے ہیں کہ گھر میں کیا ہے اور کیا ہو رہا ہے اس ہی طرح سے اہلِ دنیا بھی میڈیا کی وجہ سے دنیا میں ہونے والی چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی اچھائی اور برائی سے واقف ہیں۔

تمام ممالک اور قوموں کے طرزِ معاشرت، رہن سہن، طور طریقے، رسم و رواج اور حالات علیحدہ علیحدہ ہوتے ہیں۔ اس طرح اخلاق بنانے بگاڑنے اور اس پر اثر انداز ہونے والے عوامل بھی علاقائی لحاظ سے ترتیب پاتے ہیں مثلاً مختلف ایام اور تہواروں پر خوشی منانے کے انداز' ساحلوں' پہاڑوں' سبزہ زاروں' برفانی علاقوں' پُر فضا اور تفریحی مقامات پر سیر سپاٹے کے طور طریقے' شادی بیاہ کے رسم و رواج' مخلوط تعلیم کے انداز' ذہنی و جسمانی اور نفسیاتی آزادی کے مفہوم مختلف قوموں اور علاقوں میں مختلف ہوتے ہیں۔

مشرقی اور مغربی تہذیب و تمدن میں تو زمین آسمان کا فرق ہے۔ مشرق میں عورت جتنے زیادہ کپڑوں میں ملبوس ہوگی اتنی ہی خوبصورت لگے گی مغرب میں مختصر ترین کپڑے خوبصورتی کا معیار ہے۔ مشرق میں لڑکا ہو یا لڑکی، شرم و حیا' لحاظ و آداب' شائستگی' عمدہ لب و لہجہ اور اخلاق اس کی بہترین سیرت کی عکاسی کرتے ہیں۔ مغرب میں بے حیائی' عریانیت' بزرگوں سے ہمسری' غیر شائستگی' تند و تیز لہجہ' چرب زبانی اور کھرے پن کے نام پر بداخلاقی اور کسی کا لحاظ نہ کرنا سیرت کا حصہ ہیں۔ مشرق میں

بزرگوں کا قرب اوران کا سر پر سایہ غنیمت سمجھا جاتا ہے اوران سے مشورے لئے جاتے ہیں جبکہ مغرب میں بزرگوں سے بیزار ہوکر اولڈ ہوم میں پھینک دیا جاتا ہے تا کہ وہ نوجوان کی بے راہ روی اور آزادی میں مخل نہ ہوں۔ مشرق میں ماں، بہن بیٹی اور بیوی کا قابلِ احترام رشتہ ہوتا ہے۔ مشرقی تہذیب کے دلدادہ اس کی حرمت و تعظیم اور تحفظ کے لئے اپنا جان و مال سب کچھ قربان کر دیتے ہیں جبکہ مغرب میں جگہ جگہ مختلف شکلوں میں یہ پامال ہوتا ہوا نظر آتا ہے۔

میڈیا کی وجہ سے پوری دنیا ایک سوسائٹی بن گئی ہے۔ ہر شخص کے پاس اچھائی اور برائی میڈیا کے کسی نہ کسی ذریعے سے پہنچ رہی ہے۔ سوسائٹی، ماحول اور صحبت کے اثرات لاشعوری طور پر قلب ونظر کا حصہ بن جاتے ہیں۔ انسان لاکھ بچنے کی کوشش کرے لیکن ماحول کے اثرات سے بچ نہیں سکتا۔ آپ نے سنا ہوگا یوں تو ہر بچہ فطرت کے مطابق ہی اس دنیا میں آتا ہے۔ بہت معصوم ہوتا ہے لیکن یہ ماحول ہی ہے جو اُسے اچھا یا بناتا ہے۔ نقالی بچے کی فطرت ہوتی ہے وہ دوسروں کو جو کچھ کرتے ہوئے دیکھتا ہے وہی خود کرنا چاہتا ہے۔ 24 سال کی عمر تک ذہن میں پختگی اور ٹھہراؤ نہیں ہوتا لہٰذا زندگی کا یہی زمانہ سب سے زیادہ خطرناک ہے۔ کچے ذہن پر جو نقش ہو جاتا ہے اس کا ہٹانا ممکن نہیں ہوتا۔ بس اوقات عمر کے اس حصے کے لوگ برائی کو برائی نہیں سمجھتے۔ دوستوں کی بری صحبت سے بچنے کے بجائے اپنے ہی خیر خواہوں اور ہمدردوں کو چھوڑ دیتے ہیں۔ حتیٰ کہ ماں باپ تک کی نصیحت بری لگتی ہے اور اگر وہ سختی کریں تو ان سے بھی کنارہ کش ہو جاتے ہیں۔

اس زاویے سے اگر ہم میڈیا ہماری نئی نسل برباد کر رہا ہے کیونکہ میڈیا کا اور ہمارا چوبیس گھنٹے کا ساتھ ہے۔ میڈیا ہمارا ماحول اور ہماری سوسائٹی بن گیا ہے۔ نوجوان میڈیا سے ہر وقت اتنے چپکے رہتے ہیں جیسے دوستوں کے جھرمٹ میں ہوں۔ چوری، لڑائی، جھگڑا، دشمنی، غیبت، زنا، اغوا اور قتل وغارت گری کے عملی نمونے، مختلف اور دلچسپ انداز میں دیکھتے ہیں۔ ایک تو ویسے ہی انسانی فطرت ہے کہ شیطانی کاموں میں دلکشی نظر آتی ہے بالائے ستم یہ کہ میڈیا والے اور خوبصورت بنا کر پیش کرتے ہیں۔ جب غنڈوں، ڈاکوؤں، دہشت گردوں اور اسمگلروں کے ٹھاٹ باٹ، ان کا خوف، رعب و دبدبہ، شان و شوکت، عیش و عشرت والی زندگی، معاشرے پر ان کی حکمرانی اور بے خوف وخطر ان کو ہر وہ کام کرتے ہوئے دکھایا جائے گا جس کا عام آدمی تصور بھی نہیں کر سکتا اور سونے پر سہاگہ یہ کہ ان لوگوں کو ایسے ایسے طور طریقے، حکمتِ عملیاں اور ترکیبیں استعمال کرتے ہوئے دکھایا جاتا ہے کہ جس کے سامنے قانون نافذ کرنے والے ادارے اور حکومت بھی بے بس ہوتی ہے تو ہر نوجوان کا دل یہی چاہتا ہے کہ وہ بھی ایسی ہی زندگی گزارے کیونکہ اس میں بڑا کرّ وفرّ، شان اور دلکشی نظر آتی ہے۔

میڈیا کی آزادی کا سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ ہمارے ملک میں مغربیت اور غیر مسلموں کے طور طریقے فروغ پا رہے ہیں۔ نوجوان نسل کے حلیے، لباس، وضع قطع، لب ولہجہ، اسٹائل، حرکات اور چھچھورپن پر نظر ڈالئے سب وہی اور سب سے زیادہ تکلیف دہ پہلو یہ کے عریانیت، بے حیائی اور بداخلاقی پھیل رہی ہے بلکہ فیشن ایبل ہونے، ترقی یافتہ کہلانے اور ہائی سوسائٹی سے تعلق ظاہر کرنے کے لئے یہ چیزیں علامت بنتی جا رہی ہیں۔ صاحبِ اختیار حضرات کی یہ ذمے داری ہے کہ وہ نوجوان نسل کو بربادی سے بچانے کے لئے مؤثر پالیسیاں بنائیں اوران کو عملی جامہ پہنائیں۔

☆.....☆.....☆

☆ پاکستان میں الیکشن اور مڈٹرم کی گہما گہمی

الیکشن کا زمانہ بھی عجیب زمانہ ہے۔ ہمارے یہاں تعلیم کی کمی ہے اس لئے عوام میں الیکش کے بارے میں وہ شعور نہیں ہے جو ایک ترقی یافتہ ملک کی عوام میں ہوتا ہے۔ ہمارے ملک کے لوگ خود یہ فیصلہ نہیں کر پاتے کہ کسی امیدوار میں لیاقت، قابلیت اور صلاحیت ہے اور کون ان کے مسائل حل کر سکے گا۔ کس کو منتخب کرنا چاہئے اور کس کو نہیں۔ اس کمزوری سے سیاستدان پورا پورا فائدہ اٹھاتے ہیں اور طرح طرح کے جتن کر کے لوگوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کراتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جیسے جیسے الیکشن کا دن قریب آتا جاتا ہے الیکشن کی گہما گہمی میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ حتیٰ کے آخر کے دنوں میں تو یہ گہما گہمی اپنے عروج پر ہوتی ہے۔ جدھر نظر اٹھتی ہے رنگ برنگے بینرز لگے ہوئے نظر آتے ہیں۔ دیواریں عجیب وغریب نعروں سے بھری ہوتی ہیں۔ بلند و بالا عمارتوں سے لے کر چھوٹے چھوٹے مکانات حتیٰ کہ جھونپڑیوں تک پر جھنڈیاں اور جھنڈے لگے ہوتے ہیں۔ بعض مکانات اور مقامات پر تو روشنیوں کا بھی اہتمام کیا جاتا ہے۔ رکشوں، ٹیکسیوں اور بسوں پر نظر ڈالو تو ایسا لگتا ہے کہ گویا وہ ہاتھوں میں جھنڈے لئے دوڑے چلے جا رہے ہوں۔ موٹر سائیکل والے نوجوان تو اتنے جوشیلے ہو جاتے ہیں کہ اپنی گاڑیوں کے سائیلنسر نکال کر پوری پوری

M.HARIS BASIM

رات شور وغل مچاتے ہوئے ادھر اُدھر گاڑیاں دوڑاتے پھرتے ہیں۔

اخبارات اور رسائل الیکشن سے متعلق اشتہارات اور مضامین سے بھرے ہوتے ہیں۔ سنجیدہ بحث ومباحثے کے ساتھ ستھ طنز ومزاح اور کارٹون بھی دلچسپی کا سامان پیدا کرتے ہیں۔ ٹی وی اور انٹرنیٹ بھی بڑے بڑے سیاحت دانوں اور ان کی پارٹی سے متعلق معلومات وعوام تک پہنچاتے ہیں۔ عام عوام کی تفریحِ طبع کے لئے عمدہ پروگرام پیش کرتے ہیں۔ بڑے بڑے سیاسی ایوانوں میں دعوتیں اڑائی جاتی ہیں اور عوام کو اپنی طرف راغب کرنے کے لئے پروگرام تشکیل دیئے جاتے ہیں۔

بس یہی مختصر سا گہما گہمی کا زمانہ ہوتا ہے جس میں بڑے بڑے امیر کبیر لوگ، جاگیردار اور وڈیرے شاندار جلسوں' جلوسوں کی شکل میں غریب عوام کے پاس آتے ہیں۔ ان کو سبز باغ دکھاتے ہیں۔ ہر طرح کے وعدے کرتے ہیں۔ غریب غرباء سے عاجزی وانکساری سے ملتے ہیں، ہمدردی کا اظہار کرتے ہیں اور جب ان کے ووٹوں سے کامیاب ہوجاتے ہیں تو پھر اس طرح بھول جاتے ہیں جیسے کبھی ملے ہی نہ تھے۔ پاکستان میں الیکشن کی گہما گہمی سیاستدانوں کے مقاصد پورا کرنے میں بہت مدد کرتی ہے۔

M.HARIS BASIM